اسلام کا نظام حیات

مکتبہ جماعت اسلامی (ہند)

M.L

فرد ۹۰ ص

A.L 37 ص

سادہ

ذوق 21 ص

قامت 27 ص

M.L 28 ص

M.L 30 ص

عباس M.L 32 ص

زبیدہ - 36

اسلام کا

نظامِ حیات

از

سید ابوالاعلیٰ مودودی

شائع کردہ

مکتبہ جماعتِ اسلامی ہند رامپور یوپی

قیمت ۸ ؍

اسلام کا نظامِ حیات

اسلام کا اخلاقی نظام

اسلام کا سیاسی نظام

اسلام کا معاشرتی نظام

اسلام کا اقتصادی نظام

اسلام کا روحانی نظام

باہتمام محمد عبدالحی پرنٹر و پبلشر - اسٹیٹ پریس رام پور میں طبع ہو کر
مکتبہ جماعت اسلامی ہند - رام پور سے شائع ہوا -

اخلاقی نظام

انسان کے اندر اخلاقی حِس ایک فطری حِس ہے جو بعض صفات کو پسند اور بعض دوسری صفات کو ناپسند کرتی ہے۔ یہ حِسِ انفرادی طور پر اشخاص میں چاہے کم و بیش ہو۔ مگر مجموعی طور پر انسانیت کے شعور نے اخلاق کے بعض اوصاف پر خوبی کا اور بعض پر بُرائی کا ہمیشہ یکساں حکم لگایا ہے۔ سچائی، انصاف، پاسِ عہد اور امانت کو ہمیشہ سے انسانی اخلاقیات میں تعریف کا مستحق سمجھا گیا ہے، اور کبھی کوئی ایسا دور نہیں گذرا جب جھوٹ، ظلم، بدعہدی اور خیانت کو پسند کیا گیا ہو۔ ہمدردی رحم، فیاضی اور فراخدلی کی ہمیشہ قدر کی گئی ہے اور خود غرضی، سنگدلی، بخل اور تنگ نظری کو کبھی عزت کا مقام حاصل نہیں ہوا صبر و تحمل، استقلال و بردباری اولوالعزمی و شجاعت ہمیشہ سے وہ اوصاف رہے ہیں جو داد کے مستحق سمجھے گئے اور بے صبری چھچھورا پن، تلوّن مزاجی، پست حوصلگی اور بزدلی پر کبھی تحسین و آفریں کے پھول نہیں برسائے گئے۔ ضبطِ نفس، خودداری، شائستگی اور ملنساری کا شمار ہمیشہ سے خوبیوں میں ہوتا رہا۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بندگیٔ نفس، کم ظرفی، بدتمیزی اور کج خلقی نے اخلاقی محاسن کی فہرست میں جگہ پائی ہو۔ فرض شناسی، وفاشعاری، مستعدی اور احساسِ ذمہ داری

کی ہمیشہ عزت کی گئی، اور نا فرض شناس، بے وفا، کام چور اور غیر ذمہ دار لوگوں کو کبھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ اسی طرح اجتماعی زندگی کے اچھے اور برے اوصاف کے معاملے میں بھی انسانیت کا فیصلہ تقریباً متفق علیہ ہی رہا ہے۔ قدر کی مستحق ہمیشہ وہی سوسائٹی رہی ہے جس میں نظم و انضباط ہو، تعاون اور امداد باہمی ہو، آپس کی محبت اور خیر خواہی ہو، اجتماعی انصاف اور معاشرتی مساوات ہو۔ تفرقہ، انتشار، بد نظمی، بے ضابطگی، نا اتفاقی اور آپس کی بد خواہی ظلم اور ناہمواری کو اجتماعی زندگی کے محاسن میں کبھی شمار نہیں کیا گیا۔ ایسا ہی معاملہ کردار کی نیکی اور بدی کا بھی ہے۔ چوری، زنا، قتل، ڈاکہ، جعل سازی اور رشوت خواری کبھی اچھے افعال نہیں سمجھے گئے، بد زبانی، مردم آزاری، غیبت، چغل خوری، حسد، بہتان تراشی اور فساد انگیزی کو کبھی نیکی نہیں سمجھا گیا، مکار، متکبر، ریاکار، منافق، ہٹ دھرم اور حریص لوگ کبھی بھلے آدمیوں میں شمار نہیں کئے گئے، اس کے برعکس والدین کی خدمت رشتہ داروں کی مدد، ہمسایوں سے سلوک، دوستوں سے رفاقت، کمزوروں کی حمایت، یتیموں اور بیکسوں کی خبر گیری، مریضوں کی تیمارداری اور مصیبت زدہ لوگوں کی اعانت ہمیشہ نیکی سمجھی گئی ہے۔ پاک دامن خوش گفتار نرم مزاج اور خیر اندیش لوگ ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔ انسانیت اپنا اچھا عنصر انہیں لوگوں کو سمجھتی رہی ہے، جو راست باز اور کھرے ہوں۔ جن پر ہر معاملے میں اعتماد کیا جا سکے، جن کا ظاہر و باطن یکساں اور قول و فعل مطابق ہو، جو اپنے حق پر قانع اور

دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں فراخ دل ہوں، جو امن سے رہیں اور
دوسروں کو امن دیں، جن کی ذات سے ہر ایک کو خیر کی اُمید ہو اور کسی کو
بُرائی کا اندیشہ نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی اخلاقیات دراصل وہ عالمگیر حقیقتیں
ہیں جن کو سب انسان جانتے ہیں اور ہمیشہ سے جانتے چلے آرہے ہیں۔
نیکی اور بدی کوئی چھپی ہوئی چیزیں نہیں ہیں کہ ان کو کہیں سے ڈھونڈ کر نکالنے
کی ضرورت ہو۔ وہ تو انسانیت کی جانی پہچانی چیزیں ہیں، جن کا شعور آدمی
کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اپنی زبان
میں نیکی کو معروف اور بدی کو منکر کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے
یعنی نیکی وہ چیز ہے جسے سب انسان بھلا جانتے ہیں اور منکر وہ جسے کوئی
خوبی اور بھلائی کی حیثیت سے نہیں جانتا۔ اسی حقیقت کو قرآن دوسرے
الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے کہ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا یعنی
نفس انسانی کو خدا نے بُرائی اور بھلائی کی واقفیت الہامی طور پر عطا کر رکھی ہے

اب سوال یہ ہے کہ اگر اخلاق کی بُرائی اور بھلائی جانی پہچانی چیزیں ہیں
اور دُنیا ہمیشہ بعض صفات کے نیک اور بعض کے بد ہونے پر متفق رہی ہے
تو پھر دُنیا میں یہ مختلف اخلاقی نظام کیسے ہیں؟ ان کے درمیان فرق کس بنا پر
ہے؟ کیا چیز ہے جس کے باعث ہم کہتے ہیں کہ اسلام اپنا ایک مستقل اخلاقی
نظام رکھتا ہے؟ اور اخلاق کے معاملہ میں آخر اسلام کا وہ خاص عطیہ
Contribution کیا ہے جسے اس کی امتیازی خصوصیت

کہا جا سکے۔

اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے جب ہم دُنیا کے مختلف اخلاقی نظاموں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پہلی نظر میں جو فرق ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ مختلف اخلاقی صفات کو زندگی کے مجموعی نظام میں سمونے، اور اُن کی حد، اُن کا مقام، اور ان کا مصرف تجویز کرنے، اور اُن کے درمیان تناسب قائم کرنے میں یہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں پھر زیادہ گہری نگاہ سے دیکھنے پر اس فرق کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دراصل وہ اخلاقی حُسن و قبح کا معیار تجویز کرنے اور خیر و شر کے علم کا ذریعہ متعین کرنے میں مختلف ہیں اور ان کے درمیان اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ قانون اخلاق کے پیچھے وہ قوت نافذہ Sanction. کون سی ہے جس کے زور سے وہ جاری ہو، اور وہ کیا محرکات ہیں، جو انسان کو اس قانون کی پابندی پر آمادہ کریں لیکن جب ہم اس اختلاف کے اسباب کا کھوج لگاتے ہیں تو آخر کار یہ حقیقت ہم پر کھلتی ہے کہ وہ اصلی چیز جس نے ان سب اخلاقی نظاموں کے راستے الگ کر دیئے ہیں یہ ہے کہ اُن کے درمیان کائنات کے تصور، کائنات کے اندر انسان کی حیثیت، اور انسانی زندگی کے مقصد میں اختلاف ہے اور اسی اختلاف نے جڑ سے لیکر شاخوں تک اُن کی روح، اُن کے مزاج اور ان کی شکل کو ایک دوسرے سے بالکل مختلف کر دیا ہے۔ انسان کی زندگی میں اصلی فیصلہ کن سوالات یہ ہیں۔ کہ اس کائنات کا کوئی خدا ہے یا نہیں؟ ہے تو وہ ایک ہے یا بہت سے ہیں؟

جس کی خدائی بھی مانی جائے، اس کی صفات کیا ہیں؟ ہمارے ساتھ اسکا تعلق کیا ہے؟ اس نے ہماری رہنمائی کا کوئی انتظام کیا ہے یا نہیں؟ ہم اس کے سامنے جواب دہ ہیں یا نہیں؟ جواب دہ ہیں تو کس چیز کی جوابدہی ہمیں کرنی ہے؟ اور ہماری زندگی کا مقصد اور انجام کیا ہے جسے پیش نظر رکھکر ہم کام کریں؟ ان سوالات کا جواب جس نوعیت کا ہوگا اسی کے مطابق نظامِ زندگی بنے گا اور اسی کے مناسب حال نظامِ اخلاق تیار ہوگا۔

اس مختصر گفتگو میں میرے لئے یہ مشکل ہے کہ میں دنیا کے مختلف نظام ہائے حیات کا جائزہ لے کر بتاؤں کہ ان میں سے کس کس نے ان سوالات کا کونسا جواب اختیار کیا ہے اور اس جواب نے اس کی شکل اور راستے کے تعین پر کیا اثر ڈالا ہے میں صرف اسلام کے متعلق عرض کروں گا کہ وہ ان سوالات کا کیا جواب اختیار کرتا ہے، اور اسکی بنا پر کس مخصوص قسم کا نظامِ اخلاق وجود میں آتا ہے۔

اسلام کا جواب یہ ہے کہ اس کائنات کا خدا ہے اور وہ ایک ہی خدا ہے۔ اسی نے اسے پیدا کیا ہے، وہی اس کا لاشریک مالک، حاکم اور پروردگار ہے، اور اسی کی اطاعت پر یہ سارا نظام چل رہا ہے، وہ حکیم ہے، قادرِ مطلق ہے کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے، سبّوح و قدوس ہے (یعنی عیب، خطا، کمزوری اور نقص سے پاک ہے) اور اسکی خدائی ایسے طریقے پر قائم ہے جسمیں لاگ لپیٹ اور ٹیڑھ نہیں ہے۔ انسان اس کا پیدائشی بندہ ہے اس کا کام یہی ہے کہ اپنے خالق کی بندگی اور اطاعت کرے اسکی زندگی کے لئے کوئی صورت بجز اس کے صحیح نہیں ہے کہ وہ سراسر خدا کی بندگی ہو، اس بندگی کا طریقہ

تجویز کرنا انسان کا اپنا کام نہیں ہے، بلکہ اس خدا کا کام ہے جس کا وہ بندہ ہے۔ خدا نے اس کی رہنمائی کے لئے پیغمبر بھیجے ہیں اور کتابیں نازل کی ہیں انسان کا فرض ہے کہ اپنی زندگی کا نظام اسی سرچشمۂ ہدایت سے اخذ کرے انسان اپنی زندگی کے پورے کارنامے کے لئے خدا کے سامنے جوابدہ ہے، اور یہ جواب وہی اسے اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں کرنی ہے دنیا کی موجودہ زندگی دراصل امتحان کی مہلت ہے اور یہاں انسان کی تمام سعی و کوشش اس مقصد پر مرکوز ہونی چاہئے کہ وہ آخرت کی جواب دہی میں اپنے خدا کے حضور کامیاب ہو، اس امتحان میں انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ شریک ہے، اس کی تمام قوتوں اور قابلیتوں کا امتحان ہے، پوری کائنات میں جس جس چیز سے جیسا کچھ بھی سابقہ پیش آتا ہے اسکی بے لاگ جانچ ہونی ہے کہ انسان نے اس کے ساتھ کیسا معاملہ کیا اور یہ جانچ وہ ہستی کرنے والی ہے جس نے زمین کے ذرّوں پر ہوا اور پانی پر کائناتی لہروں پر اور خود انسان کے دل و دماغ اور دست و پا پر اس کی حرکات و سکنات ہی کا نہیں بلکہ اس کے خیالات اور ارادوں تک کا ٹھیک ٹھیک ریکارڈ مہیّا کر رکھا ہے۔

یہ ہے وہ جواب جو اسلام نے زندگی کے بنیادی سوالات کا دیا ہے یہ تصوّر کائنات و انسان اس اصلی اور انتہائی بھلائی کو متعین کر دیتا ہے جس کو پہنچنا انسانی سعی و عمل کا مقصود ہونا چاہئے، اور وہ ہے خدا کی رضا۔ یہی وہ معیار ہے جس پر اسلام کے اخلاقی نظام میں کسی طرز عمل کو پرکھ کر

یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ وہ خیر ہے یا شر، اس کے تعین سے اخلاق کو وہ محور مل جاتا ہے جس کے گرد پوری اخلاقی زندگی گھومتی ہے اور اس کی حالت بے لنگر کے سے جہاز کی سی نہیں رہتی کہ ہوا کے جھونکے اور سمندر کے تھپیڑے اسے ہر طرف دوڑاتے پھریں۔ یہ تعین ایک مرکزی مقصد سامنے رکھ دیتا ہے جس کے لحاظ سے زندگی میں تمام اخلاقی صفات کی مناسب حدیں مناسب جگہیں اور مناسب عملی صورتیں مقرر ہو جاتی ہیں اور ہمیں وہ مستقل اخلاقی قدریں (Values) ہاتھ لگ جاتی ہیں۔ جو تمام بدلے ہوئے حالات میں اپنی جگہ ثابت و قائم رہ سکیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رضائے الٰہی کے مقصود قرار پا جانے سے اخلاق کو ایک بلند ترین غایت مل جاتی ہے جس کی بدولت اخلاقی ارتقا کے امکانات لا متناہی ہو سکتے ہیں اور کسی مرحلے پر بھی اغراض پرستی کی آلائشیں اس کو ملوث نہیں کر سکتیں۔

معیار دینے کے ساتھ اسلام اپنے اسی تصور کائنات و انسان سے ہم کو اخلاقی حسن و قبح کے علم کا ایک مستقل ذریعہ بھی دیتا ہے، اس نے ہمارے اخلاقی علم کو محض عقل، یا خواہشات، یا تجربے یا علوم انسانی پر منحصر نہیں کر دیا ہے کہ ہمیشہ ان کے بدلتے ہوئے فیصلوں سے ہمارے اخلاقی احکام بھی بدلتے رہیں، اور انہیں کوئی پائیداری نصیب ہی نہ ہو سکے۔ بلکہ وہ ہمیں ایک معین ماخذ دیتا ہے (یعنی خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت) جس سے ہم کو ہر حال اور ہر زمانے میں اخلاقی ہدایات ملتی ہیں

اور یہ ہدایات ایسی ہیں کہ خانگی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لیکر بین الاقوامی سیاست کے بڑے سے بڑے مسائل تک زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبے میں وہ ہماری رہنمائی کرتی ہیں، ان کے اندر معاملات زندگی پر اخلاق کے اصولوں کا وسیع ترین انطباق Widest application, پایا جاتا ہے جو کسی مرحلے پر کسی دوسرے ذریعۂ علم کی احتیاج ہمیں محسوس نہیں ہونے دیتا۔

پھر اسلام کے اسی تصور کائنات و انسان میں وہ قوت نافذہ Sanction. بھی موجود ہے جس کا قانون اخلاق کی پشت پر ہونا ضروری ہے، اور وہ ہے خدا کا خوف، آخرت کی باز پرس کا اندیشہ، اور ابدی مستقبل کی خرابی کا خطرہ، اگرچہ اسلام ایک ایسی طاقتور رائے عام بھی تیار کرنا چاہتا ہے جو اجتماعی زندگی میں اشخاص اور گروہوں کو اصول اخلاق کی پابندی پر مجبور کرنے والی ہو اور ایک ایسا سیاسی نظام بھی بنانا چاہتا ہے جس کا اقتدار اخلاقی قانون کو بزور نافذ کرے، لیکن اس کا اصلی اعتماد اس خارجی دباؤ پر نہیں ہے بلکہ اس اندرونی دباؤ پر ہے جو خدا اور آخرت کے عقیدے میں مضمر ہے۔ اخلاقی احکام دینے سے پہلے اسلام آدمی کے دل میں یہ بات بٹھاتا ہے کہ تیرا معاملہ دراصل اس خدا کے ساتھ ہے جو ہر وقت ہر جگہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ تو دنیا بھر سے چھپ سکتا ہے، مگر اس سے نہیں چھپ سکتا۔ دنیا بھر کو دھوکا دے سکتا ہے مگر اسے نہیں دے سکتا۔ دنیا بھر سے بھاگ سکتا ہے مگر اس کی گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ دنیا محض تیرے ظاہر کو دیکھتی ہے مگر وہ تیری نیتوں اور ارادوں تک کو دیکھ لیتا ہے۔ دنیا کی تھوڑی سی زندگی میں تو چاہے کچھ کر لے، بہر حال ایک دن تجھے مرنا ہے

اور اس عدالت میں تجھے حاضر ہونا ہے جہاں وکالت، رشوت، سفارش، جھوٹی شہادت دھوکا اور فریب کچھ نہ چل سکے گا اور تیرے مستقبل کا بے لاگ فیصلہ ہو جائے گا۔ یہ عقیدہ بٹھا کر اسلام گویا ہر آدمی کے دل میں پولیس کی ایک چوکی بٹھا دیتا ہے جو اندر سے اس کو احکام کی تعمیل پر مجبور کرتی ہے، خواہ باہر ان احکام کی پابندی کرانے والی کوئی پولیس، عدالت اور جیل موجود ہو یا نہ ہو۔ اسلام کے قانون اخلاق کی پشت پر اصل زور یہی ہے جو اسے نافذ کراتا ہے۔ رائے عام اور حکومت کی طاقت اس کی تائید میں موجود ہو تو نور علیٰ نور ورنہ تنہا یہی ایمان مسلمان افراد اور مسلمان قوم کو سیدھا چلا سکتا ہے بشرطیکہ واقعی ایمان دلوں میں جاگزین ہو۔

اسلام کا یہ تصور کائنات وانسان وہ محرکات بھی فراہم کرتا ہے جو انسان کو قانونِ اخلاق کے مطابق عمل کرنے کے لئے اُبھارتے ہیں۔ انسان کا اس بات پر راضی ہو جانا کہ وہ خدا کو اپنا خدا مانے اور اس کی بندگی کو اپنی زندگی کا طریقہ بنالے اور اسکی رضا کو اپنا مقصدِ زندگی ٹھہرائے، یہ اس بات کے لئے کافی محرک ہے کہ وہ اِن احکام کی اطاعت کرے جن کے متعلق اسے یقین ہو کہ وہ خدا کے احکام ہیں۔ اس محرک کے ساتھ آخرت کا یہ عقیدہ بھی ایک دوسرا طاقتور محرک ہے کہ جو شخص احکام الٰہی کی اطاعت کرے گا اس کے لئے ابدی زندگی میں ایک شاندار مستقبل یقینی ہے خواہ دنیا کی اس عارضی زندگی میں اسے کتنی ہی مشکلات، نقصانات اور تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑے، اور اس کے برعکس جو یہاں سے خدا کی نافرمانیاں کرتا ہوا جائے گا اسے ابدی سزا بھگتنی پڑے گی چاہے دنیا کی اس چند روزہ زندگی میں وہ کیسے ہی مزے لوٹ لے، یہ اُمید اور یہ خوف اگر کسی کے دل میں

جاگزیں ہو تو اُس میں اتنی زبردست قوت محرکہ موجود ہے کہ وہ ایسے مواقع پر بھی اُسے ابھار سکتی ہے جہاں نیکی کا نتیجہ دُنیا میں سخت نقصان دہ نکلتا نظر آرہا ہو اور ان مواقع پر بھی بدی سے دور رکھ سکتی ہے جہاں بدی نہایت پُر لطف یا نفع بخش ہو۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اپنا تصوّرِ کائنات، اپنا معیارِ خیر و شر، اپنا ماخذِ علمِ اخلاق، اپنی قوتِ نافذہ اور اپنی قوتِ محرکہ الگ رکھتا ہے اور انہیں چیزوں کے ذریعہ سے معروف اخلاقیات کے مواد کو اپنی قدروں کے مطابق ترتیب دے کر زندگی کے تمام شعبوں میں جاری کرتا ہے۔ اسی بنا پر یہ کہنا صحیح ہے کہ اسلام اپنا ایک مکمل اور مستقل بالذات اخلاقی نظام رکھتا ہے۔ اس نظام کی امتیازی خصوصیات یوں تو بہت سی ہیں، مگر ان میں تین سب سے زیادہ نمایاں ہیں جنہیں اس کا خاص عطیہ کہا جا سکتا ہے۔

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ رضائے الٰہی کو مقصود بنا کر اخلاق کے لئے ایک ایسا بلند معیار فراہم کرتا ہے جس کی وجہ سے اخلاقی ارتقاء کے امکانات کی کوئی انتہا نہیں رہتی، ایک ماخذِ علم مقرر کر کے اخلاق کو وہ پائیداری اور استقلال بخشتا ہے جس میں ترقی کی گنجائش تو ہے مگر تلوّن اور نیرنگی کی گنجائش نہیں ہے، خوفِ خدا کے ذریعہ سے اخلاق کو وہ قوتِ نافذہ دیتا ہے جو خارجی دباؤ کے بغیر انسان سے اس کی پابندی کراتی ہے، اور خدا و آخرت کے عقیدے سے وہ قوتِ محرکہ فراہم کرتا ہے جو انسان کے اندر خود بخود قانونِ اخلاق پر عمل کرنے کی رغبت اور آمادگی پیدا کرتی ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ خواہ مخواہ کی اُپج سے کام لیکر کچھ نرالے اخلاقیات پیش نہیں کرتا اور نہ انسان کے معروف اخلاقیات میں سے بعض کو گھٹانے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے وہ انہیں اخلاقیات کو لیتا ہے جو معروف ہیں۔ اور ان میں سے چند کو نہیں بلکہ سب کو لیتا ہے، پھر زندگی میں پورے توازن اور تناسب کے ساتھ ایک ایک کا محل، مقام اور مصرف تجویز کرتا ہے اور ان کے انطباق کو اتنی وسعت دیتا ہے کہ انفرادی کردار، خانگی معاشرت، شہری زندگی، ملکی سیاست، معاشی کاروبار، منڈی، بازار، مدرسہ، عدالت، پولیس، لائن، چھاؤنی، میدانِ جنگ صلح کانفرنس، غرض زندگی کا کوئی پہلو اور شعبہ ایسا نہیں رہ جاتا جو اخلاق کے ہمہ گیر اثر سے بچ جائے۔ ہر جگہ ہر شعبۂ زندگی میں وہ اخلاق کو حکمران بناتا ہے، اور اسکی کوشش یہ ہے کہ معاملاتِ زندگی کی باگیں خواہشات، اغراض اور مصلحتوں کے بجائے اخلاق کے ہاتھ میں ہوں

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانیت سے ایک ایسے نظامِ زندگی کا مطالبہ کرتا ہے جو معروف پر قائم اور منکر سے پاک ہو، اسکی دعوت یہی ہے کہ جن بھلائیوں کو انسانیت کے ضمیر نے ہمیشہ بھلا جانا ہے، آؤ انہیں قائم کریں، اور پروان چڑھائیں اور جن برائیوں کو انسانیت ہمیشہ سے برا سمجھتی آئی ہے۔ آؤ انہیں دبائیں اور مٹائیں۔ اس دعوت پر جنھوں نے لبیک کہا انہیں کو جمع کر کے اسلام نے ایک امت بنائی جس کا نام "مسلم" تھا۔ اور ان کو ایک امت بنانے سے اس کی واحد غرض یہی تھی کہ وہ معروف کو جاری اور قائم کرنے اور منکر کو دبانے اور مٹانے کیلئے منظم سعی کریں، اب اگر اسی امت کے ہاتھوں معروف دبے اور منکر قائم ہونے لگے تو یہ ماتم کی جگہ ہے، خود اس امت کیلئے بھی اور دنیا کے لئے بھی۔

اسلام کا سیاسی نظام

اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد تین اصولوں پر رکھی گئی ہے، توحید رسالت اور خلافت، ان اصولوں کو اچھی طرح سمجھے بغیر اسلامی سیاست کے تفصیلی نظام کو سمجھنا مشکل ہے، اس لئے سب سے پہلے میں انہی کی مختصر تشریح کروں گا۔

توحید کے معنی یہ ہیں کہ خدا اس دُنیا کا اور اسکے سب رہنے والوں کا خالق ہے، پروردگار اور مالک ہے، حکومت و فرمانروائی اسی کی ہے، وہی حکم دینے اور منع کرنے کا حق رکھتا ہے اور بندگی اور طاعت بلا شرکت غیرے اسی کے لئے ہے، ہماری یہ ہستی جس کی بدولت ہم موجود ہیں، ہمارے یہ جسمانی آلات اور طاقتیں جن سے ہم کام لیتے ہیں اور ہمارے وہ اختیارات جو ہمیں دُنیا کی موجودات پر حاصل ہیں اور خود یہ موجودات جن پر ہم اپنے اختیارات استعمال کرتے ہیں اُن میں سے کوئی چیز بھی نہ ہماری پیدا کردہ اور حاصل کردہ ہے اور نہ اسکی بخشش میں خدا کے ساتھ کوئی دوسرا شریک ہے اس لئے اپنی ہستی کا مقصد اور اپنی قوتوں کا مصرف اور اپنے اختیارات کی حدود متعین کرنا نہ تو ہمارا اپنا کام ہے، نہ کسی دوسرے کو اس معاملے میں دخل دینے کا حق ہے، یہ صرف اس خدا کا کام ہے جس نے ہم کو ان قوتوں اور اختیارات کے ساتھ پیدا کیا اور دنیا کی یہ بہت سی چیزیں ہمارے تصرف میں دی ہیں

توحید کا یہ اصول انسانی حاکمیت کی سرے سے نفی کر دیتا ہے، ایک انسان ہو یا ایک خاندان، ایک طبقہ ہو یا ایک گروہ، ایک پوری قوم ہو یا مجموعی طور پر تمام دُنیا کے انسان حاکمیت کا حق بہر حال کسی کو نہیں پہنچتا، حاکم صرف خدا ہے اور اس کا حکم "قانون" ہے۔

خدا کا قانون جس ذریعے سے بندے تک پہنچتا ہے اس کا نام "رسالت" ہے۔ اس ذریعے سے ہمیں دو چیزیں ملتی ہیں۔ ایک "کتاب"، جس میں خود خدا نے اپنا قانون بیان کیا ہے، دوسرے کتاب کی مستند تشریح جو رسول نے خدا کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اپنے قول و عمل کے ذریعہ پیش کی ہے۔ خدا کی کتاب میں وہ تمام اصول بیان کر دیئے گئے ہیں جن پر انسانی زندگی کا نظام قائم ہونا چاہیئے۔ اور رسول نے کتاب کے اس منشا کے مطابق عملاً ایک نظامِ زندگی بنا کر، چلا کر اور اس کی ضروری تفصیلات بنا کر ہمارے لئے ایک نمونہ قائم کر دیا ہے انہیں دو چیزوں کے مجموعے کا نام اسلامی اصطلاح میں "شریعت" ہے اور یہی وہ اساسی دستور ہے جس پر اسلامی ریاست قائم ہوتی ہے۔

اب "خلافت" کو لیجئے یہ لفظ عربی زبان میں نیابت کے لئے بولا جاتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے دنیا میں انسان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ زمین پر خدا کا نائب ہے، یعنی اس کے ملک میں اس کے دیئے ہوئے اختیارات استعمال کرتا ہے۔ آپ جب کسی شخص کو اپنی جائداد کا انتظام سپرد کرتے ہیں تو لازماً آپ کے پیشِ نظر چار باتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ

جائداد کے اصل مالک آپ خود ہیں، نہ کہ وہ شخص۔ دوسرے یہ کہ آپ کی جائداد میں اس شخص کو آپ کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق کام کرنا چاہئے۔ تیسرے یہ کہ اسے اپنے اختیارات کو اُن حدود کے اندر استعمال کرنا چاہئے۔ جو آپ نے اس کے لئے مقرر کر دی ہیں۔ چوتھے یہ کہ آپ کی جائداد میں اُسے آپ کا منشا پورا کرنا ہوگا نہ کہ اپنا۔ یہ چار شرطیں نیابت کے تصور میں اس طرح شامل ہیں کہ نائب کا لفظ بولتے ہی خود بخود انسان کے ذہن میں آجاتی ہیں۔ اگر کوئی نائب ان چاروں شرطوں کو پورا نہ کرے تو آپ کہیں گے کہ وہ نیابت کے حدود سے تجاوز کر گیا۔ اور اس نے وہ معاہدہ توڑ دیا جو نیابت کے عین مفہوم میں شامل تھا۔ ٹھیک یہی معنی ہیں جن میں اسلام انسان کو خدا کا خلیفہ قرار دیتا ہے، اور اس خلافت کے تصور میں یہی چاروں شرطیں شامل ہیں۔ اس نظریہ سیاسی کی رو سے جو ریاست قائم ہوگی وہ دراصل خدا کی حاکمیت کے تحت انسانی خلافت ہوگی، جسے خدا کے ملک میں اس کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق، اس کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر کام کر کے اس کا منشا پورا کرنا ہوگا۔

خلافت کی اس تشریح کے سلسلے میں اتنی بات اور سمجھ لیجئے کہ اس معنی میں اسلامی نظریہ سیاسی کسی ایک شخص یا خاندان یا طبقے کو خلیفہ قرار نہیں دیتا بلکہ اس کی پوری سوسائٹی کو خلافت کا منصب سونپتا ہے۔ جو توحید اور رسالت کے بنیادی اصولوں کو تسلیم کر کے نیابت کی شرطیں پوری کرنے پر آمادہ ہو ایسی سوسائٹی بحیثیت مجموعی خلافت کی حامل ہے اور یہ خلافت اُسکے ہر ہر فرد کو

پہنچتی ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں اسلام میں "جمہوریت" کی ابتدا ہوتی ہے اسلامی معاشرے کا ہر ہر فرد خلافت کے حقوق اور اختیارات رکھتا ہے۔ ان حقوق و اختیارات میں تمام افراد بالکل برابر کے حصے دار ہیں کسی کو کسی پر نہ ترجیح حاصل ہے اور نہ یہی حق پہنچتا ہے کہ اسے ان حقوق و اختیار سے محروم کر سکے۔ ریاست کا نظم ونسق چلانے کے لئے جو حکومت بنائی جائے گی وہ انہی افراد کی مرضی سے بنے گی۔ یہی لوگ اپنے اختیارات خلافت کا ایک حصہ اُسے سونپیں گے اُسکے بننے میں ان کی رائے شامل ہوگی۔ اور اُن کے مشورے ہی سے وہ چلے گی جوان کا اعتماد حاصل کرے گا وہ ان کی طرف سے خلافت کے فرائض انجام دے گا۔ اور جو اُن کا اعتماد کھو دے گا اُسے حکومت کے منصب سے ہٹنا پڑے گا۔ اس لحاظ سے اسلامی جمہوریت ایک مکمل جمہوریت ہے۔ اتنی ہی مکمل جتنی کوئی جمہوریت مکمل ہو سکتی ہے۔ البتہ جو چیز اسلامی جمہوریت کو مغربی جمہوریت سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کا نظریہ سیاسی "جمہوری حاکمیت" کا قائل ہے اور اسلام "جمہوری خلافت" کا۔ وہاں جمہور خود بادشاہ ہیں اور یہاں بادشاہی خدا کی ہے۔ اور جمہور اس کے خلیفہ ہیں۔ وہاں اپنی شریعت جمہور آپ بناتے ہیں۔ یہاں انکو اس شریعت کی پابندی کرنی ہوتی ہے جو خدا نے اپنے رسول کے ذریعہ دی ہے وہاں حکومت کا کام جمہور کا منشا پورا کرنا ہوتا ہے۔ یہاں حکومت اور اس کے بنانے والے جمہور سب کا کام خدا کا منشا پورا کرنا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ مغربی جمہوریت ایک مطلق العنانی خدائی ہے جو اپنے اختیارات کو آزادانہ

استعمال کرتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی جمہوریت ایک پابند آئین بندگی ہے۔ جو اپنے اختیارات کو خدا کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرتی ہے۔ اب میں آپ کے سامنے اس ریاست کا ایک مختصر مگر واضح نقشہ پیش کروں گا، جو توحید، رسالت اور خلافت کی ان بنیادوں پر بنتی ہے۔

اس ریاست کا مقصد قرآن میں صاف طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ان بھلائیوں کو قائم کرے، فروغ دے، پروان چڑھائے جن سے خداوندِ عالم زندگی کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے اور اُن برائیوں کو روکے، دبائے اور مٹائے جن کا وجود انسانی زندگی میں خداوندِ عالم کو پسند نہیں ہے۔ اسلام میں ریاست کا مقصد نہ محض انتظامِ ملکی ہے اور نہ یہ کہ وہ کسی خاص قوم کی اجتماعی خواہشات کو پورا کرے۔ اس کے بجائے اسلام اس کے سامنے ایک بلند نصب العین رکھ دیتا ہے جس کے حصول میں اس کو اپنی تمام وسائل و ذرائع اور اپنی تمام طاقتیں صرف کرنی چاہئیں اور وہ یہ ہے کہ خدا اپنی زمین پر اپنے بندوں کی زندگی میں جو پاکیزگی، جو حسن، جو خیر و صلاح اور جو ترقی و فلاح دیکھنا چاہتا ہے وہ رونما ہو اور بگاڑ کی اُن تمام صورتوں کا سدِ باب ہو جو خدا کے نزدیک اس کی زمین کو اجاڑنے والی اور اس کے بندوں کی زندگی خراب کرنے والی ہیں۔ اس نصب العین کو پیش کرنے کے ساتھ اسلام ہمارے سامنے خیر و شر دونوں کی ایک واضح تصویر رکھتا ہے جس میں مطلوبہ بھلائیوں اور ناپسندیدہ برائیوں کو صاف صاف نمایاں کر دیا گیا ہے۔ اس تصویر کو نگاہ میں رکھ کر ہر زمانے میں اور ہر ماحول میں اسلامی ریاست

اپنا اصلاحی پروگرام بناسکتی ہے۔

اسلام کا مستقل تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اخلاقی اصولوں کی پابندی کی جائے۔ اس لئے وہ اپنی ریاست کے لئے بھی قطعی پالیسی متعین کر دیتا ہے کہ اس کی سیاست بے لاگ انصاف، بے لوث سچائی اور کھری ایمانداری پر قائم ہو۔ وہ ملکی یا انتظامی یا قومی مصلحتوں کی خاطر جھوٹ، فریب، اور بے انصافی کو کسی حال میں گوارا کرنے کیلئے تیار نہیں ہے۔ ملک کے اندر راعی اور رعایا کے باہمی تعلقات ہوں یا ملک سے باہر دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات، دونوں میں وہ صداقت دیانت اور انصاف کو اغراض و مقاصد پر مقدم رکھنا چاہتا ہے مسلمان افراد کی طرح مسلم ریاست پر بھی وہ یہ پابندی عائد کرتا ہے کہ عہد کرو تو اُسے وفا کرو۔ لینے اور دینے کے پیمانے یکساں رکھو، جو کچھ کہتے ہو، وہی کرو اور جو کچھ کرتے ہو وہی کہو۔ اپنے حق کے ساتھ اپنے فرض کو بھی یاد رکھو، اور دوسرے کے فرض کے ساتھ اس کے حق کو بھی نہ بھولو طاقت کو ظلم کے بجائے انصاف کے قیام کا ذریعہ بناؤ، حق کو بہر حال حق سمجھو اور اُسے ادا کرو، اقتدار کو خدا کی امانت سمجھو اور اس یقین کے ساتھ اسے استعمال کرو کہ اس امانت کا پورا حساب تمہیں اپنے خدا کو دینا ہے

اسلامی ریاست اگرچہ زمین کے کسی خاص خطہ ہی میں قائم ہوتی ہے مگر وہ نہ انسانی حقوق کو ایک جغرافی حد میں محدود رکھتی ہے اور نہ شہریت کے حقوق کو جہاں تک انسانیت کا تعلق ہے اسلام ہر انسان کے لئے چند

بنیادی حقوق قرار دیتا ہے اور ہر حال میں اُن کے احترام کا حکم دیتا ہے۔
خواہ وہ انسان اسلامی ریاست کی حدود میں رہتا ہو یا اس سے باہر، خواہ دوست ہو یا دشمن، خواہ صُلح رکھتا ہو یا برسرِ جنگ ہو، انسانی خون ہر حالت میں محترم ہے اور حق کے بغیر اُسے نہیں بہایا جا سکتا، عورت، بچے، بوڑھے، بیمار اور زخمی پر دست درازی کرنا کسی حال میں جائز نہیں، عورت کی عصمت بہرحال احترام کی مستحق ہے اور اسے بے آبرو نہیں کیا جا سکتا، بھوکا آدمی روٹی کا، ننگا کپڑے کا، اور زخمی یا بیمار آدمی علاج کا اور تیمارداری کا بہرحال مستحق ہے۔ خواہ وہ دشمن قوم سے تعلق رکھتا ہو، یہ اور ایسے ہی چند دوسرے حقوق اسلام نے انسان کو بحیثیت انسان ہونے کے عطا کئے ہیں۔ اور اسلامی ریاست کے دستور میں ان کو بنیادی حقوق کی جگہ حاصل ہو رہے شہریت کے حقوق، تو وہ بھی اسلام صرف انہیں لوگوں کو نہیں دیتا جو اسکی ریاست کی حدود میں .... بلکہ ہر مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے میں پیدا ہوا ہو اسلامی ریاست کی حدود میں داخل ہوتے ہی آپ سے آپ اس کا شہری بن جاتا ہے اور پیدائشی شہریوں کے برابر حقوق کا مستحق قرار پاتا ہے۔ دنیا میں جتنی اسلامی ریاستیں بھی ہوں گی ان سب کے درمیان شہریت مشترک ہوگی مسلمان کو کسی اسلامی ریاست میں داخل ہونے کے لئے پاسپورٹ کی ضرورت نہ ہوگی مسلمان کسی نسلی، قومی یا طبقاتی امتیاز کے بغیر ہر اسلامی ریاست میں بڑے سے بڑے ذمہ داری کے منصب کا اہل ہو سکتا ہے

غیر مسلموں کے لئے جو کسی اسلامی ریاست کے حدود میں رہتے ہوں اسلام نے چند حقوق معین کر دئے ہیں اور وہ لازماً دستورِ اسلامی کا جزو ہوں گے اسلامی اصطلاح میں ایسے غیر مسلم کو "ذمی" کہا جاتا ہے۔ یعنی جس کی حفاظت کا اسلامی ریاست نے ذمہ لیا ہے، ذمی کی جان و مال اور آبرو مسلمان کی جان و مال اور آبرو کی طرح محترم ہے، فوجداری اور دیوانی قوانین میں مسلم اور ذمی کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ ذمیوں کے پرسنل لاء میں اسلامی ریاست کوئی مداخلت نہ کرے گی۔ ذمیوں کو ضمیر و اعتقاد اور مذہبی رسوم و عبادات میں پوری آزادی حاصل ہوگی۔ ذمی اپنے مذہب کی تبلیغ ہی نہیں بلکہ قانون کی حد میں رہتے ہوئے اسلام پر تنقید بھی کر سکتا ہے یہ اور ایسے بہت سے حقوق اسلامی دستور میں غیر مسلم رعایا کو دیئے گئے ہیں اور یہ مستقل حقوق ہیں جنہیں اس وقت تک سلب نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ ہمارے ذمے سے خارج نہ ہو جائیں۔ کوئی غیر مسلم حکومت اپنی مسلم رعایا پر چاہے کتنے ہی ظلم ڈھائے ایک اسلامی ریاست کے لئے اس کے جواب میں اپنی غیر مسلم رعایا پر شریعت کے خلاف ذرا سی دست درازی کرنا بھی جائز نہیں، حتیٰ کہ ہماری سرحد کے باہر اگر سارے مسلمان قتل کر دیئے جائیں تب بھی ہم اپنی حد میں ایک ذمی کا خون حق کے بغیر نہیں بہا سکتے۔

اسلامی ریاست کے انتظام کی ذمہ داری ایک امیر کے سپرد کر دی جائے گی، جسے صدر جمہوریہ کے مماثل سمجھنا چاہئے، امیر کے انتخاب میں ان تمام بالغ مردوں اور عورتوں کو رائے دینے کا حق ہوگا جو دستور کے

اصولوں کو تسلیم کرتے ہوں، انتخاب کی بنیاد یہ ہوگی کہ روح اسلام کی واقفیت اسلامی سیرت، خدا ترسی اور تدبر کے اعتبار سے کون شخص سوسائٹی کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کا اعتماد رکھتا ہے، ایسے شخص کو امارت کے لئے منتخب کیا جائے گا۔ پھر اس کی مدد کے لئے ایک مجلس شوریٰ بنائی جائے گی۔ اور وہ بھی لوگوں کی منتخب کردہ ہوگی، امیر کے لئے لازم ہوگا کہ ملک کا انتظام اہلِ شوریٰ کے مشورے سے کرے، ایک امیر اسی وقت تک حکمراں رہ سکتا ہے جب تک لوگوں کا اعتماد اسے حاصل ہوگا، عدم اعتماد کی صورت میں اُسے جگہ خالی کرنی ہوگی اور جب تک وہ لوگوں کا اعتماد رکھتا ہے اُسے حکومت کے پورے اختیارات حاصل رہیں گے اور وہ شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں اپنا ویٹو استعمال کرسکے گا، امیر اور اسکی حکومت پر عام شہریوں کو نکتہ چینی کا پورا حق حاصل ہوگا۔

اسلامی ریاست میں قانون سازی ان حدود کے اندر ہوگی جو شریعت میں مقرر کردی گئی ہیں، خدا اور رسول کے احکام صرف اطاعت کیلئے ہیں کوئی مجلس قانون ساز ان میں رد و بدل نہیں کرسکتی، رہے وہ احکام جن میں دو یا زیادہ تعبیریں ممکن ہیں تو ان میں شریعت کا منشا معلوم کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو شریعت کا علم رکھتے ہوں اس لئے ایسے معاملات مجلس شوریٰ کی اس سب کمیٹی کے سپرد کئے جائیں گے، جو علماء پر مشتمل ہوگی، اس کے بعد ایک وسیع میدان ان معاملات کا ہے جن میں شریعت نے کوئی حکم نہیں دیا۔ ایسے تمام معاملات میں مجلس شوریٰ قوانین بنانے

ہیں دینی حدود کے اندر رہ کر آزاد ہے۔

اسلام میں عدالت انتظامی حکومت کے ماتحت نہیں بلکہ براہِ راست خدا کی نمائندہ اور اس کی جواب دہ ہوتی ہے۔ حاکمانِ عدالت کو مقرر تو انتظامی حکومت ہی کرے گی، مگر جب ایک شخص عدالت کی کرسی پر بیٹھ جائے گا تو وہ خدا کے قانون کے مطابق لوگوں کے درمیان بے لاگ انصاف کرے گا اور اس کے انصاف کی زد سے خود حکومت بھی نہ بچ سکے گی، حتیٰ کہ خود حکومت کے رئیس اعلیٰ کو بھی مدعی یا مدعا علیہ کی حیثیت سے اس کے سامنے اسی طرح حاضر ہونا پڑے گا۔ جیسے عام شہری ہوتا ہے۔

اِسلام کا معاشرتی نظام

اسلام کے معاشرتی نظام کا سنگِ بنیاد یہ نظریہ ہے کہ دنیا کے سب انسان ایک نسل سے ہیں۔ خدا نے سب سے پہلے ایک انسانی جوڑا پیدا کیا تھا۔ پھر اسی جوڑے سے وہ سارے لوگ پیدا ہوئے جو دُنیا میں آباد ہیں۔ ابتدا میں ایک مدت تک اس جوڑے کی اولاد ایک ہی امت بنی رہی۔ ایک ہی اس کا دین تھا۔ ایک ہی اس کی زبان تھی۔ کوئی اختلاف اس کے درمیان نہ تھا، مگر جوں جوں اُن کی تعداد بڑھتی گئی، وہ زمین پر پھیلتے چلے گئے اور اس پھیلاؤ کی وجہ سے قدرتی طور پر مختلف نسلوں، قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہوگئے ان کی زبانیں الگ ہوگئیں، اُن کے لباس الگ ہوگئے، رہن سہن کے طریقے الگ ہوگئے اور جگہ جگہ کی آب وہوا نے اُن کے رنگ روپ خدوخال تک بدل دئے۔ یہ سب اختلافات فطری اختلافات ہیں واقعات کی دنیا میں موجود ہیں۔ اس لئے اسلام ان کو بطور ایک واقعہ کے تسلیم کرتا ہے، وہ ان کو مٹانا نہیں چاہتا، بلکہ ان کا یہ فائدہ مانتا ہے کہ انسانوں کا باہمی تعارف اور تعاون اسی صورت سے ممکن ہے۔ لیکن ان اختلافات کی بنا پر انسانوں میں نسل، رنگ، زبان قومیت اور وطنیت کے جو تعصبات پیدا ہوگئے ہیں اِن سب کو اسلام غلط قرار دیتا ہے۔

انسان اور انسان کے درمیان اونچ نیچ، شریف و کمین، اپنے اور غیر کے جتنے فرق پیدائش کی بنیاد پر کرلئے گئے ہیں۔ اسلام کے نزدیک یہ سب جاہلیت کی باتیں ہیں۔ وہ تمام دنیا کے انسانوں سے کہتا ہے کہ تم سب ایک ماں اور ایک باپ کی اولاد ہو، لہذا ایک دوسرے کے بھائی ہو۔ اور انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہو۔

انسانیت کا یہ تصور اختیار کرنے کے بعد اسلام کہتا ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان اصلی فرق اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ نسل، رنگ، وطن اور زبان کا نہیں بلکہ خیالات، اخلاق اور اصولوں کا ہو سکتا ہے، ایک ماں کے دو بچے اپنے نسب کے لحاظ سے چاہے ایک ہوں لیکن اگر ان کے خیالات اور اخلاق ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو زندگی میں دونوں کی راہیں الگ ہو جائیں گی، اس کے برعکس مشرق اور مغرب کے انتہائی فاصلے پر رہنے والے دو انسان اگرچہ ظاہر میں کتنے ہی ایک دوسرے سے دور ہوں لیکن اگر خیالات میں متفق ہیں اور اخلاق ملتے جلتے ہیں تو ان کی زندگی کا راستہ ایک ہوگا۔ اس نظریئے کی بنیاد پر اسلام دنیا کے تمام نسلی، وطنی اور قومی معاشروں کے برعکس ایک فکری، اخلاقی اور اصولی معاشرہ تعمیر کرتا ہے جس میں انسان اور انسان کے ملنے کی بنیاد اس کی پیدائش نہیں بلکہ ایک عقیدہ ہے ایک اخلاقی ضابطہ ہے ہر وہ شخص جو خدا کو اپنا مالک و معبود مانے اور پیغمبروں کی لائی ہوئی ہدایت کو اپنا قانون زندگی تسلیم کرے، اس معاشرے میں شامل ہو سکتا ہے خواہ وہ افریقہ کا رہنے والا ہو یا امریکہ کا۔ خواہ وہ

سامی نسل کا ہو یا آریہ نسل کا، خواہ وہ کالا ہو یا گورا، خواہ وہ ہندی بولتا ہو یا عربی، جو انسان بھی اِس معاشرے میں شامل ہوں گے، ان سب کے حقوق اور معاشرتی مرتبے یکساں ہوں گے کسی قسم کی نسلی، قومی یا طبقاتی امتیازات ان کے درمیان نہ ہوں گے، کوئی اونچا یا نیچا نہ ہوگا۔ کوئی چھوت چھات ان میں نہ ہوگی۔ کسی کا ہاتھ لگنے سے کوئی ناپاک نہ ہوگا۔

شادی بیاہ اور کھانے پینے اور مجلسی میل جول میں اُن کے درمیان کسی قسم کی رکاوٹیں نہ ہوں گی، کوئی اپنی پیدائش یا اپنے پیشے کے لحاظ سے ذلیل یا کمین نہ ہوگا۔ کسی کو اپنی ذات برادری یا حسب و نسب کی بنا پر کوئی مخصوص حقوق حاصل نہ ہو سکیں گے، آدمی کی بزرگی اس کے خاندان یا اس کے مال کی وجہ سے نہ ہوگی، بلکہ صرف اِس وجہ سے ہوگی کہ اس کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں اور وہ خدا ترسی میں دوسروں سے زیادہ بڑھا ہوا ہے،

یہ ایسا معاشرہ ہے جو نسل، رنگ اور زبان کی حد بندیوں اور جغرافی سرحدوں کو توڑ کر روئے زمین کے تمام خطوں پر پھیل سکتا ہے اور اس کی بنیاد پر انسانوں کی ایک عالمگیر برادری قائم ہو سکتی ہے۔ نسلی اور وطنی معاشروں میں تو صرف وہ لوگ شامل ہو سکتے ہیں جو کسی نسل یا وطن میں پیدا ہوئے ہوں۔ اس سے باہر کے لوگوں پر ایسے معاشرے کا دروازہ بند ہوتا ہے مگر اِس فکری اور اصولی معاشرے میں ہر وہ شخص برابر کے حقوق کے ساتھ شامل ہو سکتا ہے، جو ایک عقیدے اور ایک اخلاقی ضابطے کو تسلیم کرے۔ رہے وہ لوگ جو اِس عقیدے

اور ضابطے کو نہ مانیں تو یہ معاشرہ انہیں اپنے دائرہ میں نہیں لیتا، مگر انسانی برادری کا تعلق ان کے ساتھ قائم کرنے اور انسانیت کے حقوق انہیں دینے کے لئے تیار ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک ماں کے دو بچے اگر خیالات میں مختلف ہیں تو ان کے طریق زندگی بہر حال مختلف ہوں گے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ایک دوسرے کے بھائی نہیں رہے۔ بالکل اسی طرح نسلِ انسانی کے دو گروہ بھی اگر عقیدے اور اصول میں اختلاف رکھتے ہیں تو ان کے معاشرے یقیناً الگ ہوں گے مگر انسانیت بہر حال ان میں مشترک رہے گی۔ اِن مشترک انسانیت کی بنا پر زیادہ سے زیادہ جن حقوق کا تصور کیا جا سکتا ہے وہ سب اسلامی معاشرے نے غیر اسلامی معاشروں کے لئے تسلیم کئے ہیں۔

اسلامی نظام معاشرت کی اِن بنیادوں کو سمجھ لینے کے بعد آیئے اب ہم دیکھیں کہ وہ کیا اصول اور طریقے ہیں جو اسلام نے انسانی میل ملاپ کی مختلف صورتوں کے لئے مقرر کئے ہیں۔

انسانی معاشرت کا اولین اور بنیادی ادارہ خاندان ہے۔ خاندان کی بنا ایک مرد اور ایک عورت کے ملنے سے پڑتی ہے، اس ملاپ سے ایک نئی نسل وجود میں آتی ہے پھر اس سے رشتے اور کنبے اور برادری کے دوسرے تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور بالآخر یہی چیز پھیلتے پھیلتے ایک معاشرے تک پہنچتی ہے پھر خاندان ہی وہ ادارہ ہے جس میں ایک نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو انسانی تمدن کی وسیع خدمات سنبھالنے کے لئے نہایت محبت، ایثار، دل سوزی اور خیر خواہی کے ساتھ تیار کرتی ہے

یہ ادارہ تمدنِ انسانی کی بقا کے لئے اور نشو ونما کے لئے صرف رنگروٹ ہی بھرتی نہیں کرتا بلکہ اس کے کارکن دِل سے اس بات کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ ان کی جگہ لینے والے خود ان سے بہتر ہوں۔ اس بنا پر یہ ایک حقیقت ہے کہ خاندان ہی انسانی تمدن کی جڑ ہے اور اِس جڑ کی صحت و طاقت پر خود تمدن کی صحت و طاقت کا مدار ہے۔ اسی لئے اسلام معاشرتی مسائل میں سب سے پہلے اس امر کی طرف توجہ کرتا ہے کہ خاندان کے ادارے کو صحیح ترین اور مضبوط ترین بُنیادوں پر قائم کیا جائے۔

اسلام کے نزدیک مرد اور عورت کے تعلق کی صورت صرف وہ ہے جس کے ساتھ معاشرتی ذمہ داریاں قبول کی گئی ہوں اور جس کے نتیجے میں ایک خاندان کی بنا پڑے۔ آزادانہ و غیر ذمہ دارانہ تعلق کو وہ محض ایک معصوم سی تفریح یا ایک معمولی سی بے راہ روی سمجھ کر ٹال نہیں دیتا بلکہ اس کی نگاہ میں یہ انسانی تمدن کی جڑ کاٹ دینے والا فعل ہے اس لئے ایسے تعلق کو وہ حرام اور قانونی جُرم قرار دیتا ہے اِس کے لئے سخت سزا تجویز کرتا ہے تاکہ سوسائٹی میں ایسے تمدن کش تعلقات رائج نہ ہونے پائیں اور معاشرت کو ان اسباب سے پاک کر دینا چاہتا ہے جو غیر ذمہ دارانہ تعلق کے لئے محرک ہوئے ہوں یا اس کے لئے مواقع پیدا کرتے ہوں۔ پردے کے احکام مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول کی ممانعت، موسیقی اور تصاویر پر پابندیاں، فواحش کی اشاعت کے خلاف رکاوٹیں سب اسی چیز کی روک تھام کے لئے ہیں اور ان کا مرکزی مقصد خاندان کے

ادارے کو محفوظ اور مضبوط کرنا ہے، دوسری طرف ذمہ دارانہ تعلق یعنی نکاح کو اسلام محض جائز ہی نہیں بلکہ اسے ایک نیکی، کارِ ثواب اور ایک عبادت قرار دیتا ہے۔ سنِ بلوغ کے بعد مرد اور عورت کے مجرّد رہنے کو ناپسند کرتا ہے۔ ہر نوجوان کو اس پر اکساتا ہے کہ تمدن کی جن ذمہ داریوں کا بار اس کے ماں باپ نے اٹھایا تھا اپنی باری آنے پر وہ بھی انہیں اٹھائے اسلام رہبانیت کو نیکی نہیں سمجھتا بلکہ اُسے فطرت اللہ کے خلاف ایک بدعت ٹھہراتا ہے۔ وہ اِن تمام رسموں اور رواجوں کو بھی ناپسند کرتا ہے جن کی وجہ سے نکاح ایک مشکل اور بھاری کام بن جاتا ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ معاشرے میں نکاح کو آسان ترین فعل ہونا چاہیے۔ نہ یہ کہ نکاح مشکل اور زنا آسان ہو۔ اسی لئے اس نے چند مخصوص رشتوں کو حرام ٹھہرانے کے بعد تمام دور ونزدیک کے رشتہ داروں میں ازدواجی تعلق کو جائز کر دیا ہے، ذات برادری کی تفریقیں اڑا کر تمام مسلمانوں میں آپس کے شادی بیاہ کی کھلی اجازت دیدی ہے۔ مہر اور جہیز اس قدر ہلکے رکھنے کا حکم دیا ہے جنہیں فریقین بآسانی برداشت کر سکیں اور رسم نکاح ادا کرنے کے لئے کسی قاضی، پنڈت پروہت، یا دفتر رجسٹر کی کوئی ضرورت نہیں رکھی، اسلامی معاشرے کا نکاح ایک ایسی سادہ سی رسم ہے جو ہر کہیں دو گواہوں کے سامنے بالغ زوجین کے ایجاب وقبول سے انجام پا سکتی ہے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ یہ ایجاب وقبول خفیہ نہ ہو بلکہ بستی

ہیں اعلان کے ساتھ ہو۔

خاندان کے اندر اسلام نے مرد کو ناظم کی حیثیت دی ہے تاکہ وہ اپنے گھر میں ضبط قائم رکھے۔ بیوی کو شوہر کی اور اولاد کو ماں اور باپ دونوں کی اطاعت و خدمت کا حکم دیا ہے۔ ایسے ڈھیلے ڈھالے نظام خاندانی کو اسلام پسند نہیں کرتا جس میں کوئی انضباط نہ ہو اور گھر والوں کے اخلاق و معاملات درست رکھنے کا کوئی بھی ذمہ دار نہ ہو۔ نظم بہر حال ایک ذمہ دار ناظم ہی سے قائم ہو سکتا ہے۔ اور اسلام کے نزدیک اس ذمہ داری کے لئے خاندان کا باپ ہی فطرتاً موزوں ہے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مرد کو گھر کا ایک جابر و قاہر فرماں روا بنایا گیا ہے۔ اور عورت ایک بے بس لونڈی کی حیثیت سے اس کے حوالے کر دی گئی ہے اسلام کے نزدیک ازدواجی زندگی کی اصل روح محبت و رحمت ہے۔ عورت کا فرض اگر شوہر کی اطاعت ہے تو مرد کا بھی یہ فرض ہے کہ اپنے اختیارات کو اصلاح کے لئے استعمال کرے نہ کہ زیادتی کے لئے۔ اسلام ایک ازدواجی تعلق کو اسی وقت تک باقی رکھنا چاہتا ہے جب تک اس میں محبت کی شیرینی یا کم از کم رفاقت کا امکان باقی ہو۔ جہاں یہ امکان باقی نہ رہے وہاں وہ مرد کو طلاق اور عورت کو خلع کا حکم دیتا ہے۔ اور بعض صورتوں میں اسلامی عدالت کو یہ اختیار عطا کرتا ہے کہ وہ ایسے نکاح کو توڑ دے جو رحمت کے بجائے زحمت بن گیا ہو۔

خاندان کے محدود دائرے سے باہر قریب ترین سرحد رشتہ داری

کی ہے جس کا دائرہ کافی وسیع ہوتا ہے۔ جو لوگ ماں اور باپ کے تعلق سے یا بھائی اور بہنوں کے تعلق سے یا سسرالی تعلق سے ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوں اسلام ان سب کو ایک دوسرے کا ہمدرد۔ مددگار اور غم گسار دیکھنا چاہتا ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ ذَوِی الْقُرْبیٰ یعنی رشتہ داروں سے نیک سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیث میں صلہ رحمی کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور اُسے بڑی نیکی شمار کیا گیا ہے۔ وہ شخص اسلام کی نگاہ میں سخت ناپسندیدہ ہے جو اپنے رشتہ داروں سے سرد مہری اور طوطا چشمی کا معاملہ کرے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ رشتہ داروں کی بے جا طرفداری کوئی اسلامی کام ہے۔ اپنے کنبے قبیلے کی ایسی حمایت جو حق کے خلاف ہو، اسلام کے نزدیک جاہلیت ہے اسی طرح اگر حکومت کا کوئی افسر پبلک کے خرچ پر اقربا پروری کرنے لگے یا اپنے فیصلوں میں اپنے عزیزوں کے ساتھ بے جا رعایت کرنے لگے تو یہ بھی کوئی اسلامی کام نہیں ہے بلکہ ایک شیطانی حرکت ہے اسلام جس صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے وہ اپنی ذات سے ہونی چاہیے اور حق و انصاف کی حد کے اندر ہونی چاہیے۔

رشتہ داری کے تعلق کے بعد دوسرا قریب ترین تعلق ہمسائیگی کا ہے۔ قرآن کی رو سے ہمسایوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک رشتہ دار ہمسایہ، دوسرا اجنبی ہمسایہ اور تیسرا عارضی ہمسایہ جس کے پاس بیٹھنے یا ساتھ چلنے کا آدمی کو اتفاق ہو۔ یہ سب اسلامی احکام کی رو سے رفاقت، ہمدردی اور نیک سلوک کے مستحق ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے ہمسایہ کے حقوق کی اتنی تاکید

کی گئی ہے کہ میں خیال کرنے لگا کہ شاید اب اسے وراثت میں حصہ دار بنا دیا جائیگا۔
ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "وہ شخص مومن نہیں ہے۔ جس کا ہمسایا اسکی شرارتوں سے امن میں نہ ہو۔ ایک دوسری حدیث میں آپ کا ارشاد ہے کہ "وہ شخص ایمان نہیں رکھتا جو خود پیٹ بھر کر کھالے اور اس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا رہجائے" ایک مرتبہ آنحضرت سے عرض کیا گیا کہ ایک عورت بہت نمازیں پڑھتی ہے، اکثر روزے رکھتی ہے، خوب خیرات کرتی ہے مگر اس کی بد زبانی سے پڑوسی عاجز ہیں آپ نے فرمایا "وہ دوزخی ہے" لوگوں نے عرض کیا کہ ایک دوسری عورت ہے جس میں یہ خوبیاں تو نہیں ہیں مگر وہ پڑوسیوں کو تکلیف کبھی نہیں دیتی فرمایا وہ جنتی ہے"۔
آنحضرتؐ نے لوگوں کو یہاں تک تاکید فرمائی تھی کہ اپنے بچوں کے لئے اگر پھل لاؤ تو یا تو ہمسایہ کے گھر بھی بھیجو ورنہ چھلکے باہر نہ پھینکو تاکہ غریب ہمسایہ کا دل نہ دکھے ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ اگر تیرے ہمسائے تجھے اچھا کہتے ہیں تو واقعی تو اچھا ہے اور اگر ہمسایہ کی رائے تیرے بارے میں خراب ہے تو تو برا آدمی ہے۔ مختصر یہ کہ اسلام ان سب لوگوں کو جو ایک دوسرے کے پڑوسی ہوں آپس میں ہمدرد، مددگار اور شریک رنج وراحت دیکھنا چاہتا ہے۔ ان کے درمیان ایسے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے کہ وہ سب ایک دوسرے پر بھروسہ کریں اور ایک دوسرے کے پہلو میں اپنی جان ومال اور آبرو کو محفوظ سمجھیں، رہی وہ معاشرت جس میں ایک دیوار بیچ رہنے والے دو آدمی برسوں ایک دوسرے سے ناآشنا رہیں اور جس میں ایک محلے کے رہنے والے باہم کوئی دلچسپی کوئی ہمدردی اور کوئی اعتماد نہ

رکھتے ہوں تو ایسی معاشرت ہرگز اسلامی معاشرت نہیں ہوسکتی۔

ان قریبی رابطوں کے بعد تعلقات کا وہ وسیع دائرہ سامنے آتا ہے جو پورے معاشرے پر پھیلا ہوا ہے اس دائرے میں اسلام ہماری اجتماعی زندگی کو جن بڑے بڑے اصولوں پر قائم کرتا ہے وہ مختصراً یہ ہیں۔

(۱) نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تعاون کرو اور بدی اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو (قرآن)

(۲) تمہاری دوستی اور دشمنی خدا کے خاطر ہونی چاہیئے جو کچھ دو اس لئے دو کہ خدا اسکا دینا پسند کرتا ہے اور جو کچھ روکو اس لئے روکو، کہ خدا کو اسکا دینا پسند نہیں ہے (حدیث)

(۳) تم وہ بہترین امت ہو جسے دنیا والوں کی بھلائی کے لئے اٹھایا گیا ہے تمہارا کام نیکی کا حکم دینا اور بدی کو روکنا ہے (قرآن)

(۴) آپس میں بدگمانی نہ کرو، ایک دوسرے کے معاملات کا تجسس نہ کرو، ایک کے خلاف دوسرے کو نہ اکساؤ، آپس کے حسد اور بغض سے بچو، ایک دوسرے کی کاٹ میں نہ پڑو۔ اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بن کر رہو۔ (حدیث)

(۵) کسی کو ظالم جانتے ہوئے اس کا ساتھ نہ دو (حدیث)

(۶) غیر حق میں اپنی قوم کی حمایت کرنا ایسا ہے جیسے تمہارا اونٹ کنوئیں میں گرنے لگا تو تم بھی اسکی دم پکڑ کر اوس کے ساتھ جا گرے (حدیث)

(۷) دوسروں کے لئے وہی کچھ پسند کرو جو تم خود اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ (حدیث)

اسلام کا اقتصادی نظام

انسان کی معاشی زندگی کو انصاف اور راستی پر قائم رکھنے کے لئے اسلام نے چند اصول اور چند حدود مقرر کر دیئے ہیں، تاکہ دولت کی پیدائش، استعمال اور گردش کا سارا نظام انہی خطوط کے اندر چلے جو اس کے لئے کھینچ دئے گئے ہیں۔

دولت کی پیداوار کے طریقے اور اسکی گردش کی صورتیں کیا ہوں، اسلام کو اس سوال سے کوئی بحث نہیں ہے۔ یہ چیزیں تو مختلف زمانوں میں تمدن کے نشوونما کے ساتھ ساتھ مبنی اور بدلتی رہتی ہیں، ان کا تعین انسانی حالات و ضروریات کے لحاظ سے خود بخود ہو جاتا ہے۔ اسلام جو کچھ چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ تمام زمانوں اور حالات میں انسان کے معاشی معاملات جو شکلیں بھی اختیار کریں ان میں یہ اصول مستقل طور پر قائم رہیں اور ان حدود کی لازماً پابندی کی جائے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے زمین اور اسکی سب چیزیں خدا نے نوعِ انسانی کے لئے بنائی ہیں، اس لئے ہر انسان کا یہ پیدائشی حق ہے کہ زمین سے اپنا رزق حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس حق میں تمام انسان برابر کے شریک ہیں کسی کو اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ نہ کسی کو اس معاملہ میں دوسروں پر ترجیح ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ کسی شخص یا نسل یا طبقے پر ایسی کوئی پابندی ازروئے شرع عائد نہیں ہو سکتی کہ وہ رزق کے وسائل میں سے بعض کو استعمال کرنے کا حقدار ہی نہ ہے، یا بعض پیشوں کا دروازہ اس کے لئے بند کر دیا جائے۔ اسی طرح ایسے

امتیازات بھی شرعاً قائم نہیں ہو سکتے جن کی بنا پر کوئی ذریعہ معاش یا وسیلۂ رزق کسی مخصوص طبقے یا نسل یا خاندان کا اجارہ بن کر رہ جائے، خدا کی بنائی ہوئی زمین پر اس کے پیدا کئے ہوئے وسائلِ رزق میں سے اپنا حصہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا سب انسانوں کا یکساں حق ہے اور اس کوشش کے مواقع سب کے لئے یکساں کھلے ہونے چاہئیں۔

قدرت کی جن نعمتوں کو تیار کرنے یا کار آمد بنانے میں کسی کی محنت و قابلیت کا کوئی دخل نہ ہو وہ سب انسانوں کے لئے مباح عام ہیں ہر شخص کو حق ہے کہ اپنی ضرورت بھر ان سے فائدہ اٹھائے، دریاؤں اور چشموں کا پانی جنگل کی لکڑی، قدرتی درختوں کے پھل، خود رو گھاس اور چارہ، ہوا اور پانی اور صحرا کے جانور، سطح زمین پر کھلی ہوئی کانیں، اس قسم کی چیزوں پر نہ تو کسی کی اجارہ داری قائم ہو سکتی ہے، اور نہ ایسی پابندیاں لگائی جا سکتی ہیں کہ بندگانِ خدا کچھ دیئے بغیر ان سے اپنی ضرورتیں پوری نہ کر سکیں، ہاں جو لوگ تجارتی اغراض کے لئے بڑے پیمانے پر ان میں سے کسی چیز کو استعمال کرنا چاہیں ان پر ٹیکس لگایا جا سکتا ہے۔

خدا نے جو چیزیں انسان کے فائدے کے لئے بنائی ہیں انہیں لے کر بیکار ڈال رکھنا صحیح نہیں ہے۔ یا تو اُن سے خود فائدہ اٹھاؤ ورنہ چھوڑ دو تاکہ دوسرے ان سے متمتع ہوں۔ اسی اصول کی بنا پر اسلامی قانون یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کوئی شخص اپنی زمین کو تین سال سے زیادہ مدت تک افتادہ حالت میں نہیں رکھ سکتا۔ اگر وہ اس کو زراعت یا عمارت یا کسی دوسرے کام میں استعمال نہ کرے تو تین سال گذر جانے کے بعد وہ متروکہ زمین سمجھی جائے گی، کوئی دوسرا شخص

اسے کام میں لے آئے تو اس پر دعویٰ نہ کیا جائے گا، اور اسلامی حکومت کو بھی یہ اختیار نہ ہوگا کہ اس زمین کو کسی کے حوالے کر دے۔

جو شخص براہِ راست قدرت کے خزانے میں سے کوئی چیز لے اور اپنی محنت و قابلیت سے اس کو کارآمد بنائے وہ اس چیز کا مالک ہے۔ مثلاً کسی افتادہ زمین کو، جس پر کسی کے حقوق ملکیت ثابت نہ ہوں، اگر کوئی شخص اپنے قبضے میں لے لے اور کسی مفید کام میں اُسے استعمال کرنا شروع کر دے تو اس کو بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی نظریئے کے مطابق دنیا میں تمام مالکانہ حقوق کی ابتدا اسی طرح ہوئی ہے۔ پہلے پہل جب زمین پر انسانی آبادی شروع ہوئی تو سب چیزیں سب انسانوں کے لئے مباحِ عام تھیں، پھر جس جس شخص نے جس مباح چیز کو اپنے قبضہ میں لے کر کسی طور پر کارآمد بنا لیا وہ اس کا مالک ہو گیا۔ یعنی اسے یہ حق حاصل ہو گیا کہ اس کا استعمال اپنے لئے مخصوص رکھے اور دوسرے اسے استعمال کرنا چاہیں تو ان سے اس کا معاوضہ لے۔ یہ چیز انسان کے سارے معاشی معاملات کی فطری بنیاد ہے اور اس بنیاد کو اپنی جگہ قائم رہنا چاہئے۔

جائز شرعی طریقوں سے جو مالکانہ حقوق کسی کو دنیا میں حاصل ہوں وہ بہر حال احترام کے مستحق ہیں۔ کلام اگر ہو سکتا ہے تو اس امر میں ہو سکتا ہے کہ کوئی ملکیت شرعاً صحیح ہے یا نہیں۔ جو ملکیتیں از روئے شرع ناجائز ہوں انہیں بے شک ختم ہو جانا چاہیئے، مگر جو ملکیتیں شرعاً صحیح ہوں کسی حکومت اور کسی مجلس قانون ساز کو یہ حق نہیں ہے کہ انہیں سلب کر لے

یا ان کے مالکوں کے شرعی حقوق میں کسی قسم کی کمی بیشی کرے اجتماعی بہتری کا نام لے کر کوئی ایسا نظام قائم نہیں کیا جا سکتا جو شریعت کے دیئے ہوئے حقوق کو پامال کرنیوالا ہو جماعت کے مفاد کے لئے افراد کی ملکیتوں پر جو پابندیاں شریعت نے خود ہی لگا دی ہیں ان میں کمی کرنا جتنا بڑا ظلم ہے۔ اتنا ہی بڑا ظلم ان پر اضافہ کرنا بھی ہے یہ بات اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے کہ افراد کے شرعی حقوق کی حفاظت کرے اور ان سے جماعت کے وہ حقوق وصول کرے جو شریعت نے ان پر عائد کئے ہیں۔

خدا نے اپنی نعمتوں کی تقسیم میں مساوات ملحوظ نہیں رکھی ہے بلکہ اپنی حکمت کی بنا پر بعض انسانوں کو بعض پر فضیلت ہے، حسن، خوش آوازی، تندرستی جسمانی طاقتیں دماغی قابلیتیں، پیدائشی ماحول اور اسی طرح کی دوسری چیزیں سب انسانوں کو یکساں نہیں ملیں۔ ایسا ہی معاملہ رزق کا بھی ہے، خدا کی بنائی ہوئی فطرت خود اس بات کی متقاضی ہے کہ انسانوں کے درمیان رزق میں تفاوت ہو لہٰذا وہ تمام تدبیریں اسلامی نقطۂ نظر سے مقصد اور اصول میں غلط ہیں جو انسانوں کے درمیان ایک مصنوعی معاشی مساوات قائم کرنے کے لئے اختیار کی جائیں۔ اسلام جس مساوات کا قائل ہے وہ رزق میں مساوات نہیں بلکہ حصولِ رزق کی جدوجہد کے مواقع میں مساوات ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ سوسائٹی میں ایسی قانونی اور رواجی رکاوٹیں باقی نہ رہیں جن کی بنا پر کوئی شخص اپنی قوت و استعداد کے مطابق معاشی جدوجہد نہ کر سکتا ہو۔ اور ایسے امتیازات بھی قائم نہ رہیں جو بعض طبقوں، نسلوں اور خاندانوں کی پیدائشی خوش نصیبی کو مستقل قانونی تحفظات میں تبدیل کر دینے والے ہوں

یہ دونوں طریقے فطری نامساوات کی جگہ زبردستی ایک مصنوعی نامساوات قائم کرتے ہیں۔ اس لئے اسلام انہیں مٹا کر سوسائٹی کے معاشی نظام کو ایسی فطری حالت پر لے آنا چاہتا ہے جس میں ہر شخص کے لئے کوشش کے مواقع کھلے ہوں مگر جو لوگ چاہتے ہیں کہ کوشش کے ذرائع اور نتائج میں بھی سب لوگوں کو زبردستی برابر کر دیا جائے۔ اسلام ان سے متفق نہیں ہے، کیونکہ وہ فطری نامساوات کو مصنوعی مساوات میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ فطرت سے قریب تر نظام صرف وہی ہو سکتا ہے جس میں ہر شخص معیشت کے میدان میں اپنی دوڑ کی ابتدا اسی مقام اور اسی حالت سے کرے جس پر خدا نے اسے پیدا کیا ہے جو موٹر لئے ہوئے آیا ہے وہ موٹر ہی پر چلے، جو صرف دو پاؤں لایا ہے وہ پیدل ہی چلے، اور جو لنگڑا پیدا ہوا ہے وہ لنگڑا کر ہی چلنا شروع کرے سوسائٹی کا قانون نہ تو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ موٹر والے کا مستقل اجارہ موٹر پر قائم کر دے اور لنگڑے کے لئے موٹر کا حصول ناممکن بنا دے، اور نہ ایسا ہی ہونا چاہیئے کہ سب کی دوڑ زبردستی ایک ہی مقام اور ایک ہی حالت سے شروع ہو اور آخر تک انہیں لازماً ایک دوسرے کے ہاتھ باندھ رکھا جائے، برعکس اس کے قوانین ایسے ہونے چاہئیں جن میں اس امر کا کھلا امکان موجود رہے کہ جس نے اپنی دوڑ لنگڑا کر شروع کی تھی وہ اپنی محنت اور قابلیت سے موٹر پا سکتا ہو تو ضرور پائے، اور جو ابتدا میں موٹر پر چلا تھا وہ بعد میں اپنی نااہلی سے لنگڑا ہو کر رہ جائے تو رہ جائے۔

اسلام صرف اتنا ہی نہیں چاہتا کہ اجتماعی زندگی میں یہ معاشی دوڑ کھلی اور

بے لاگ ہو بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس میدان میں دوڑنے والے ایک دوسرے کے لئے بے رحم اور بے درد نہ ہوں۔ ہمدرد اور مددگار رہوں، وہ ایک طرف اپنی اخلاقی تعلیم سے لوگوں میں یہ ذہنیت پیدا کرتا ہے کہ اپنے درماندہ اور پسماندہ بھائیوں کو سہارا دیں، دوسری طرف وہ تقاضا کرتا ہے کہ سوسائٹی میں ایک مستقل ادارہ ایسا موجود رہے جو معذور اور بے وسیلہ لوگوں کی مدد کا ضامن ہو جو لوگ معاشی دوڑ میں حصّہ لینے کے قابل نہ ہوں وہ اس ادارے سے اپنا حصّہ پائیں، جو لوگ اتفاقات زمانہ سے اس دوڑ میں گر پڑے ہوں انہیں یہ ادارہ اٹھا کر پھر چلنے کے قابل بنائے اور جن لوگوں کو جدوجہد کے میدان میں اُترنے کیلئے سہارے کی ضرورت ہو انہیں اس ادارے سے سہارا ملے، اس مقصد کے لئے اسلام نے از روئے قانون یہ طے کیا ہے کہ ملک کی تمام جمع شدہ دولت پر ڈھائی فی صدی سالانہ اور اسی طرح پورے تجارتی سرمایہ پر بھی ڈھائی فی صدی سالانہ زکوٰۃ وصول کی جائے، تمام عشری زمینوں کی زرعی پیداوار کا دس فیصدی یا پانچ فی صدی حصہ لیا جائے بعض معدنیات کی پیداوار کا بیس فی صدی حصہ لیا جائے۔ مویشیوں کی ایک خاص تعداد پر ایک خاص تناسب سے سالانہ زکوٰۃ لگائی جائے اور یہ تمام سرمایہ غریبوں یتیموں، اور محتاجوں کی مدد کے لئے استعمال کیا جائے۔ یہ ایک ایسا اجتماعی انشورنس ہے کہ جس کی موجودگی میں اسلامی سوسائٹی کے اندر کوئی شخص زندگی کی ناگزیر ضروریات سے کبھی محروم نہیں رہ سکتا۔ کوئی محنت کش آدمی کبھی اتنا مجبور نہیں ہو سکتا کہ فاقے کے ڈر سے خدمت کی وہی شرائط منظور کرلے جو

کارخانہ دار یا زمیندار پیش کر رہا ہو کسی شخص کی طاقت اس کم سے کم معیار سے کبھی نیچے نہیں گر سکتی جو معاشی جد وجہد میں حصّہ لینے کے لئے ضروری ہے۔

فرد اور جماعت کے درمیان اسلام ایسا توازن قائم کرنا چاہتا ہے جس میں فرد کی شخصیت اور اس کی آزادی بھی برقرار رہے اور اجتماعی مفاد کے لئے اس کی آزادی نقصان دہ بھی نہ ہو بلکہ لازمی طور پر مفید ہو۔ اسلام کسی ایسی سیاسی یا معاشی تنظیم کو پسند نہیں کرتا جو فرد کو جماعت میں گم کر دے اور اس کے لئے وہ آزادی باقی نہ چھوڑے جو اس کی شخصیت کے صحیح نشو ونما کے لئے ضروری ہے۔ کسی ملک کے تمام ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنا دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ملک کے تمام افراد جماعتی شکنجہ میں جکڑ جائیں، اس حالت میں ان کی انفرادیت کا بقا وارتقاء سخت مشکل بلکہ غیر ممکن ہے۔ انفرادیت کے لئے جس طرح سیاسی اور معاشرتی آزادی ضروری ہے اسی طرح معاشی آزادی بھی بہت بڑی حد تک ضروری ہے۔ اگر ہم آدمیت کا بالکل استیصال نہیں کر دینا چاہتے تو ہماری اجتماعی زندگی میں اتنی گنجائش ضرور رہنی چاہئے کہ ایک بندۂ خدا اپنی روزی آزادانہ پیدا کر کے اپنے ضمیر کا استقلال برقرار رکھ سکے اور اپنی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو اپنے رجحانات کے مطابق نشو ونما دے سکے، راتب بندی کا رزق جس کی کنجیاں دوسروں کے ہاتھ میں ہوں، اگر فراواں بھی ہو تو خوش گوار نہیں، کیونکہ اس سے پرواز میں جو کوتاہی آتی ہے۔ محض جسم کی فربہی اس کی تلافی کبھی نہیں کر سکتی۔

جس طرح اسلام ایسے نظام کو ناپسند کرتا ہے اسی طرح وہ ایسے اجتماعی نظام کو بھی پسند نہیں کرتا۔ جو افراد کو معاشرت اور معیشت میں بے لگام آزادی دیتا ہے

اور انہیں کھلی چھٹی دے دیتا ہے کہ اپنی خواہشات یا اپنے مفاد کی خاطر جماعت کو جس طرح چاہیں نقصان پہنچائیں ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اسلام نے جو متوسط راہ اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے فرد کو جماعت کی خاطر چند حدود اور ذمہ داریوں کا پابند بنایا جائے، پھر اُسے اپنے معاملات میں آزاد چھوڑ دیا جائے، ان حدود اور ذمہ داریوں کی ساری تفصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے، میں ان کا صرف ایک مختصر سا نقشہ آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

پہلے کسب معاش کو لیجئے۔ دولت کمانے کے ذرائع میں اسلام نے جتنی باریک بینی کے ساتھ جائز و ناجائز کی تفریق کی ہے اتنی دنیا کے کسی قانون نے نہیں کی۔ وہ چن چن کر ان تمام ذرائع کو حرام قرار دیتا ہے جن سے ایک شخص دوسرے اشخاص کو یا بحیثیت مجموعی پوری سوسائٹی کو اخلاقی یا مادی نقصان پہنچا کر اپنی روزی حاصل کرتا ہے۔ شراب اور نشہ آور چیزوں کا بنانا اور بیچنا، فحش کاری اور رقص و سرود کا پیشہ جوا، سٹہ، لاٹری، سود، قیاس اور دھوکے اور جھگڑے کے سودے ایسے تجارتی طریقے جن میں ایک فریق کا فائدہ یقینی اور دوسرے کا مشتبہ ہو ضرورت کی چیزوں کو روک کر ان کی قیمتیں چڑھانا اور اسی طرح کے بہت سے وہ کاروبار جو اجتماعی طور پر ضرر رساں ہیں، اسلامی قانون میں قطعی طور پر حرام کر دیئے گئے ہیں۔ اس معاملہ میں اگر آپ اسلام کے معاشی قانون کا جائزہ لیں تو حرام طریقوں کی ایک طویل فہرست آپ کے سامنے آئے گی اور ان میں بہت سے وہ طریقے آپ کو ملیں گے جنہیں استعمال کر کے ہی موجودہ سرمایہ داری نظام میں لوگ کروڑپتی، بنتے ہیں۔ اسلام اِن سب طریقوں کو از روئے قانون بند کرتا ہے۔ اور آدمی کو صرف

ان طریقوں سے دولت کمانے کی آزادی دیتا ہے جن سے وہ دوسروں کی کوئی حقیقی اور مفید خدمت انجام دیکر انصاف کے ساتھ اس کا معاوضہ حاصل کرے۔

حلال ذرائع سے کمائی ہوئی دولت پر اسلام آدمی کے حقوق ملکیت تسلیم کرتا ہے۔ مگر یہ حقوق بھی غیر محدود نہیں ہیں۔ وہ آدمی کو پابند کرتا ہے کہ اپنی حلال کمائی کو خرچ بھی جائز راستوں ہی میں کرے۔ خرچ پر اس نے ایسی قیود لگا دی ہیں جن سے آدمی ایک ستھری اور پاکیزہ زندگی تو بسر کر سکتا ہے، مگر عیاشیوں میں دولت اڑا نہیں سکتا۔ نہ شان و شوکت کے اظہار میں اس قدر حد سے گذر سکتا ہے کہ دوسروں پر اسکی خدائی کا سکہ جمنے لگے۔ بیجا خرچ کی بعض صورتوں کو تو اسلامی قانون نے صراحتاً ممنوع ٹھہرایا گیا ہے، اور بعض دوسری صورتوں کی اگرچہ صراحت نہیں ہے لیکن اسلامی حکومت کو یہ اختیارات حاصل ہیں کہ اپنی دولت میں نار وا تصرفات کرنیسے لوگوں کو حکماً روک دے۔

جائز اور معقول اخراجات سے جو دولت آدمی کے پاس بچے اسے وہ جمع بھی کر سکتا ہے۔ اور مزید دولت پیدا کرنے میں بھی لگا سکتا ہے۔ مگر ان دونوں حقوق پر پابندیاں ہیں جمع کرنے کی صورت میں اسے نصاب سے زائد دولت پر ڈھائی فی صدی سالانہ زکوٰۃ دینی ہوگی، کاروبار میں لگانا چاہے تو صرف جائز کاروبار ہی میں لگا سکتا ہے، جائز کاروبار خواہ آدمی خود کرے یا کسی دوسرے کو اپنا سرمایہ روپے، زمین، یا آلات و اسباب کی صورت میں دے کر نفع و نقصان کا شریک ہو جائے، یہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔ ان حدود کے اندر کام کرکے اگر کوئی شخص کروڑپتی بھی بن جائے تو اسلام کی نگاہ میں یہ

کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے بلکہ خدا کا انعام ہے لیکن جماعتی مفاد کے لئے وہ اس پر دو شرطیں عائد کرتا ہے ایک یہ کہ وہ اپنے تجارتی مال پر زکوٰۃ اور زرعی پیداوار پر عشر ادا کرے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنی تجارت یا صنعت یا زراعت میں جن لوگوں کے ساتھ شرکت یا اجرت کا معاملہ کرے ان سے انصاف کرے۔ یہ انصاف اگر وہ خود نہ کرے گا تو اسلامی حکومت اسے انصاف پر مجبور کر دے گی۔

پھر جو دولت ان جائز حدود کے اندر فراہم ہو اس کو بھی اسلام زیادہ دیر تک سمٹا نہیں رہنے دیتا بلکہ اپنے قانون وراثت کے ذریعہ سے ہر پشت کے بعد دوسری پشت میں اُسے پھیلا دیتا ہے۔ اس معاملے میں اسلامی قانون کا رجحان دنیا کے تمام دوسرے قوانین کے رجحانات سے مختلف ہے۔ دوسرے قوانین کوشش کرتے ہیں کہ جو دولت ایک دفعہ سمٹ چکی ہے وہ پشت در پشت سمٹی ہی رہے۔ برعکس اس کے اسلام ایسا قانون بناتا ہے کہ جو دولت ایک شخص نے اپنی زندگی میں فراہم کی ہو، وہ اس کے مرتے ہی اس کے قریبی عزیزوں میں بانٹ دی جائے۔ قریبی عزیز نہ ہوں تو دور کے رشتہ دار بحصہ رسدی اس کے وارث ہوں، اور اگر کوئی دور پڑے کا رشتہ دار بھی نہ ہو تو پھر مسلم سوسائٹی اس کی حق دار رہے۔ یہ قانون کسی بڑی سرمایہ داری یا زمینداری کو مستقل اور دائم نہیں رہنے دیتا۔ پچھلی ساری پابندیوں کے باوجود اگر دولت کے سمٹاؤ سے کوئی خرابی پیدا ہو بھی جائے تو یہ آخری ضرب اس کا ازالہ کر دیتی ہے۔

اسلام کا رُوحانی نظام

اسلام کا روحانی نظام کیا ہے، اور زندگی کے پورے نظام سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اس سوال کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم اس فرق کو اچھی طرح سمجھ لیں جو روحانیت کے اسلامی تصور اور دوسرے مذہبی اور فلسفیانہ نظاموں کے تصورات میں پایا جاتا ہے۔ یہ فرق ذہن نشین نہ ہونے کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اسلام کے روحانی نظام پر گفتگو کرتے ہوئے آدمی کے دماغ میں بلا ارادہ بہت سے وہ تصورات گھومنے لگتے ہیں جو عموماً "روحانیت" کے لفظ سے وابستہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ پھر اس اُلجھن میں پڑ کر آدمی کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ آخر یہ کس قسم کا روحانی نظام ہے جو روح کے جانے پہچانے دائرے سے گذر کر مادہ وجسم کے دائرہ میں دخل دیتا ہے اور صرف دخل ہی نہیں دیتا بلکہ اس پر حکمرانی کرنا چاہتا ہے۔

فلسفہ و مذہب کی دنیا میں عام طور پر جو تخیل کار فرما رہا ہے وہ یہ ہے کہ روح اور جسم ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دونوں کا عالم جدا ہے۔ دونوں کے تقاضے الگ بلکہ باہم مخالف ہیں، ان دونوں کی ترقی ایک ساتھ ممکن نہیں ہے۔ روح کے لئے جسم اور مادے کی دنیا ایک قید خانہ ہے دنیوی زندگی کے تعلقات اور دلچسپیاں وہ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ہیں جن میں روح جکڑی جاتی ہے۔ دنیا کے کاروبار اور معاملات وہ دلدل ہیں جس میں پھنس کر

روح کی پرواز ختم ہو جاتی ہے۔ اس تخیل کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ روحانیت اور دنیا داری کے راستے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہو گئے۔ جن لوگوں نے دنیا داری اختیار کی وہ اوّل ہی قدم پر مایوس ہو گئے کہ یہاں روحانیت اُن کے ساتھ نہ چل سکے گی۔ اس چیز نے ان کو مادہ پرستی میں غرق کر دیا۔ معاشرت، تمدن، سیاست، معیشت، غرض دنیوی زندگی کے سارے شعبے روحانیت کے نور سے خالی ہو گئے اور بالآخر زمین ظلم سے بھر گئی۔ دوسری طرف جو لوگ روحانیت کے طلبگار ہوئے انہوں نے اپنی روح کی ترقی کے لئے ایسے راستے تلاش کئے جو دنیا کے باہر ہی باہر نکل جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے نقطۂ نظر سے روحانی ترقی کا کوئی ایسا راستہ تو ممکن ہی نہ تھا جو دنیا کے اندر سے ہو کر گذرتا ہو۔ ان کے نزدیک روح کو پروان چڑھانے کے لئے جسم کو مضمحل کرنا ضروری تھا اس لئے انہوں نے ایسی ریاضتیں ایجاد کیں جو نفس کو مارنے والی اور جسم کو بے حس یا بے کار کر دینے والی ہوں۔ روحانی تربیت کے لئے جنگلوں، پہاڑوں اور عزلت کے گوشوں کو انہوں نے موزوں ترین مقامات سمجھا تاکہ تمدن کا ہنگامہ گیان، دھیان کے مشغلوں میں خلل نہ ڈالنے پائے۔ روح کے نشو ونما کی کوئی صورت انہیں اس کے سوا ممکن نظر نہ آئی کہ دنیا اور اس کے دھندوں سے دستکش ہو جائیں اور ان سارے رشتوں کو کاٹ پھینکیں جو اپنے مادیات کے عالم سے وابستہ رکھتے ہیں۔

پھر جسم و رُوح کے اس تضاد نے انسان کے لئے کمال کے

بھی دو مختلف مفہوم اور نصب العین پیدا کر دیئے۔ ایک طرف دنیوی زندگی کا کمال جس کا مفہوم یہ قرار پایا کہ انسان صرف مادّی نعمتوں سے مالا مال ہو، اور اس کی انتہا یہ ٹھہری کہ آدمی ایک اچھا پرندہ ایک بہترین مگرمچھ، ایک عمدہ گھوڑا اور ایک کامیاب بھیڑیا بن جائے۔ دوسری طرف روحانی زندگی کا کمال جس کا مفہوم یہ قرار پایا کہ انسان کچھ فوق الفطری طاقتوں کا مالک ہو جائے۔ اور اس کی انتہا یہ ٹھہری کہ آدمی ایک اچھا ریڈیو سٹ، ایک طاقتور دوربین اور ایک نازک خوردبین بن جائے۔ یا اس کی نگاہ اور اس کے الفاظ ایک پورے دواخانے کا کام دینے لگیں۔

اسلام کا نقطۂ نظر اس معاملے میں دنیا کے تمام مذہبی اور فلسفیانہ نظاموں سے مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی روح کو خدا نے زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے۔ کچھ اختیارات، کچھ فرائض اور کچھ ذمہ داریاں اس کے سپرد کی ہیں اور انہیں ادا کرنے کے لئے ایک بہترین اور موزوں ترین ساخت کا جسم اسے عطا کیا ہے۔ یہ جسم اس کو عطا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اختیارات کے استعمال اور اپنی متعلقہ خدمات کی انجام دہی میں اس سے کام لے، لہٰذا یہ جسم اس روح کا قید خانہ نہیں بلکہ اس کا کارخانہ ہے۔ اور اس روح کے لئے کوئی ترقی اگر ممکن ہے تو اسی طرح ممکن ہے کہ وہ اس کارخانے کے آلات اور طاقتوں کو استعمال کر کے اپنی قابلیتوں کا اظہار کرے۔ پھر یہ

دُنیا کوئی دارالعذاب نہیں ہے جس میں انسانی روح کسی طرح آکر پھنس گئی ہو بلکہ یہ تو وہ کارگاہ ہے جس میں کام کرنے کے لئے خدا نے اسے بھیجا ہے۔ یہاں کی بیشمار چیزیں اس کے تصرف میں دی گئی ہیں۔ یہاں دوسرے بہت سے انسان اسی خلافت کے فرائض انجام دینے کے لئے اس کے ساتھ پیدا کئے گئے ہیں، یہاں فطرت کے تقاضوں سے تمدن معاشرت، معیشت، سیاست اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی اس کے لئے وجود میں آئے ہیں، یہاں اگر کوئی روحانی ترقی ممکن ہے تو اس کی صورت یہ نہیں ہے کہ آدمی اس کارگاہ سے منھ موڑ کر کسی گوشے میں جا بیٹھے بلکہ اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اس کے اندر کام کرکے اپنی قابلیت کا ثبوت دے۔ یہ اس کے لئے ایک امتحان گاہ ہے۔ زندگی کا ہر پہلو اور ہر شعبہ گویا امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ گھر، محلہ، بازار، منڈی، دفتر، کارخانہ مدرسہ، کچہری، تھانہ، چھاونی، پارلیمنٹ، صلح کانفرنس اور میدان جنگ سب مختلف مضمونوں کے پرچے ہیں۔ جو اسے کرنے کے لئے دئے گئے ہیں، وہ اگر ان میں سے کوئی پرچہ بھی نہ کرے یا اکثر پرچوں کو سادہ ہی چھوڑ دے تو نتیجے میں آخر صفر کے سوا اور کیا پا سکتا ہے۔ کامیابی اور ترقی کا امکان اگر ہو سکتا ہے تو اسی طرح ہو سکتا ہے کہ وہ اپنا سارا وقت اور اپنی ساری توجہ امتحان دینے میں صرف کرے اور جتنے پرچے بھی اسے دئے جائیں ان سب پر کچھ نہ کچھ کر کے دکھائے۔

اس طرح اسلام زندگی کے راہبانہ تصور کو رد کر دیتا ہے اور انسان

کے لیئے روحانی ترقی کا راستہ دنیا کے باہر سے نہیں بلکہ اس کے اندر سے نکلتا ہے۔ روح کی نشو ونما اور بالیدگی اور فلاح وکامرانی کی اصل جگہ، اس کے نزدیک کارگاہ حیات کے عین منجدھار میں واقع ہے نہ کہ اس کے کنارے پر اب ہمیں دیکھنا چاہئیے کہ وہ ہمارے سامنے روح کی ترقی اور تنزل کا معیار کیا پیش کرتا ہے، اِس سوال کا جواب اسی خلافت کے تصور میں موجود ہے جس کا ابھی میں ذکر کر چکا ہوں خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انسان اپنے پورے کارنامۂ حیات کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ ہے، اس کا فرض یہ ہے کہ زمین میں جو اختیارات اور ذرائع اُسے دئے گئے ہیں انھیں خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کرے۔ جو قابلیتیں اور طاقتیں اسے بخشی گئی ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ خدا کی رضا حاصل کرنے میں صرف کرے جن مختلف قسم کے تعلقات میں دوسرے انسانوں کے ساتھ اسے وابستہ کیا گیا ہے ان میں ایسا رویہ اختیار کرے جو خدا کو پسند ہے اور فی الجملہ اپنی تمام کوششیں اور محنتیں اس راہ میں صرف کردے کہ زمین اور اس کی زندگی کا انتظام اتنا بہتر ہو جتنا اس کا خدا بہتر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس خدمت کو انسان جس قدر زیادہ احساس ذمہ داری فرض شناسی، اطاعت وفرماں برداری اور مالک کی رضا جوئی کے ساتھ انجام دے گا۔ اسی قدر زیادہ خدا سے قریب ہوگا اور خدا کا قرب ہی اسلام کی نگاہ میں روحانی ترقی ہے۔ اس کے برعکس وہ جتنا سُست کام چور اور نا فرض شناس ہوگا یا جس قدر سرکش، باغی اور نافرمان ہوگا۔ اتنا ہی وہ خدا سے دور رہے گا اور خدا سے دوری ہی نام

اسلام کی زبان میں روحانی تنزل ہے۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے دیندار اور دنیا دار دونوں کا دائرۂ عمل ایک ہی ہے، ایک ہی کارگاہ ہے جس میں دونوں کام کریں گے بلکہ دیندار آدمی دنیا دار سے بھی زیادہ انہماک کے ساتھ مشغول ہوگا گھر کی چار دیواری سے لیکر بین الاقوامی کانفرنس کے چوراہے تک جتنے بھی زندگی کے معاملات ہیں اُن سب کی ذمہ داریاں دیندار بھی دنیا دار کے برابر بلکہ اس سے کچھ بڑھ کر ہی اپنے ہاتھوں میں لے لیگا۔ البتہ جو چیز ان دونوں کے راستے ایک دوسرے سے الگ کر دے گی۔ وہ خدا کے ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت ہے۔ دیندار جو کچھ کریگا اس احساس کے ساتھ کرے گا کہ وہ خدا کے سامنے ذمہ دار ہے، اس غرض سے کریگا کہ اسے خدا کی خوشنودی حاصل ہو اور اس قانون کے مطابق کرے گا جو خدا نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ اس کے برعکس دنیا دار جو کچھ کرے گا غیر ذمہ دارانہ کرے گا، خدا سے بے نیاز ہو کر کرے گا اور اپنے من مانے طریقوں سے کریگا۔ یہی فرق دیندار کی پوری مادی زندگی کو سراسر روحانی زندگی بنا دیتا ہے اور دنیا دار کی ساری زندگی کو روحانیت کے نور سے محروم کر دیتا ہے۔

اب میں مختصر طور پر آپ کو بتاؤں گا کہ اسلام دنیوی زندگی کے اس منجدھار میں انسان کے روحانی ارتقاء کا راستہ کس طرح بناتا ہے۔

اس راستہ کا پہلا قدم ایمان ہے، یعنی آدمی کے دل و دماغ میں اس خیال کا بس جانا کہ خدا ہی اس کا مالک، حاکم اور معبود ہے، خدا کی ہی رضا اس کی تمام کوششوں کا مقصود ہے، اور خدا ہی کا حکم اس کی زندگی کا قانون ہے۔ یہ خیال

جس قدر زیادہ پختہ اور راسخ ہوگا اتنی ہی زیادہ مکمل اسلامی ذہنیت بنے گی۔ اور اسی قدر زیادہ ثابت قدمی کے ساتھ انسان روحانی ترقی کی راہ پر چل سکے گا۔

اس راہ کی دوسری منزل اطاعت ہے، یعنی آدمی کا بالفعل اپنی خود مختاری سے دست بردار ہو جانا اور عملاً اس خدا کی بندگی اختیار کرلینا جسے وہ عقیدتاً اپنا خدا تسلیم کر چکا ہے، اسی اطاعت کا نام قرآن کی اصطلاح میں اسلام ہے۔

تیسری منزل تقویٰ کی ہے جسے ہم عام فہم زبان میں فرض شناسی اور احساسِ ذمہ داری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے ہر پہلو میں یہ سمجھتے ہوئے کام کرے کہ اسے اپنے افکار، اقوال اور افعال کا خدا کو حساب دینا ہے، ہر اس کام سے رُک جائے جس سے خدا نے منع کیا ہے، ہر اس خدمت پر کمربستہ ہو جائے جس کا خدا نے حکم دیا ہے، اور پوری ہوشمندی کے ساتھ حلال و حرام صحیح و غلط اور خیر و شر کے درمیان تمیز کرتا ہوا چلے۔

آخری اور سب سے اونچی منزل احسان کی ہے۔ احسان کے معنی یہ ہیں کہ بندے کی مرضی خدا کی مرضی کے ساتھ متحد ہو جائے۔ جو کچھ خدا کی پسند ہے، بندے کی اپنی پسند بھی وہی ہو۔ اور جو کچھ خدا کو ناپسند ہے۔ بندے کا اپنا دل بھی اُسے ناپسند کرے۔ خدا جن بُرائیوں کو اپنی زمین میں دیکھنا نہیں چاہتا، بندہ صرف خود ہی اُن سے نہ بچے بلکہ انہیں دنیا سے مٹا دینے کے لئے اپنی ساری قوتیں اور اپنے تمام ذرائع صرف کر دے۔ اور خدا جن بھلائیوں سے اپنی زمین کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے بندہ صرف اپنی ہی زندگی کو اُن سے مزیّن کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ اپنی جان لڑا کر دنیا بھر میں انہیں پھیلانے اور قائم کرنے کی کوشش کرے۔ اس مقام پر پہنچکر

بندے کو اپنے خدا کا انتہائی قرب نصیب ہوتا ہے اور اسی لئے یہ انسان کے روحانی ارتقا کی بلند ترین منزل ہے۔

روحانی ترقی کا یہ راستہ صرف افراد ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ جماعتوں اور قوموں کے لئے بھی ہے، ایک فرد کی طرح ایک قوم بھی ایمان، اطاعت اور تقویٰ کی منزلوں سے گذر کر احسان کی انتہائی منزل تک پہنچ سکتی ہے۔ اور ایک ریاست بھی اپنے پورے نظام کے ساتھ مومن، مسلم، متقی اور محسن بن سکتی ہے۔ بلکہ درحقیقت اسلام کا منشا مکمل طور پر تو پورا ہی اس وقت ہوتا ہے۔ جبکہ ایک پوری قوم کی قوم اس راہ پر گامزن ہو اور دنیا میں ایک متقی اور محسن ریاست قائم ہو جائے۔

اب روحانی تربیت کے اس نظام پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجئے جو افراد اور سوسائٹی کو اس طرز پر تیار کرنے کے لئے اسلام نے تجویز کیا ہے۔ اس نظام کے چار ارکان ہیں :-

پہلا رکن نماز ہے یہ روزانہ پانچ وقت آدمی کے ذہن میں خدا کی یاد تازہ کرتی ہے، اس کا خوف دلاتی ہے۔ اس کی محبت پیدا کرتی ہے۔ اس کے احکام باربار سامنے لاتی ہے، اور اسکی اطاعت کی مشق کراتی ہے۔ یہ نماز محض انفرادی نہیں ہے۔ بلکہ اسے جماعت کے ساتھ فرض کیا گیا ہے تاکہ پوری سوسائٹی مجموعی طور پر روحانی ترقی کی اس راہ پر سفر کرنے کے لئے تیار ہو۔

دوسرا رکن روزہ ہے جو ہر سال پورے ایک مہینے تک مسلمان افراد کو فرداً فرداً اور مسلم سوسائٹی کو بحیثیت مجموعی تقویٰ کی تربیت دیتا رہتا ہے۔

تیسرا رکن زکوٰۃ ہے جو مسلمان افراد میں مالی ایثار آپس کی ہمدردی اور تعاون، کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ آجکل کے لوگ غلطی سے زکوٰۃ کو "ٹیکس" کے نقطے سے تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ زکوٰۃ کی رُوح ٹیکس کی اسپرٹ سے بالکل مختلف ہے۔ زکوٰۃ کے اصل معنی نشو ونما اور پاکیزگی کے ہیں۔ اِس نقطے سے اسلام یہ حقیقت آدمی کے ذہن نشین کرتا ہے کہ خدا کی محبت میں اپنے بھائیوں کی جو مالی امداد تم کروگے اس سے تمہاری روح کو بالیدگی اور تمہارے اخلاق کو پاکیزگی نصیب ہوگی۔

چوتھا رکن حج ہے۔ یہ خدا پرستی کے محور پر اہلِ ایمان کی ایک عالمگیر برادری بناتا ہے اور ایک ایسی بین الاقوامی تحریک چلاتا ہے جو دنیا میں صدیوں سے دعوتِ حق پر لبیک کہہ رہی ہے اور انشاء اللہ ابد تک کہتی رہے گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان خدا کا بندہ ہے۔ خدا کی بندگی اور زندگی کے ہر شعبہ میں اسکی کامل اطاعت ہی انسان کا اصل مقام ہے۔ یہ کتاب جو اسوقت آپ کے ہاتھوں میں ہے اسی نظریہ کی علمبردار تحریک — تحریک اسلامی — کے لٹریچر کا ایک حصہ ہے جس میں اسلام کی دی ہوئی تعلیمات اور اس کے بتائے ہوئے اصول و نظریات کے صرف بعض گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اسلام کی مکمل تعلیم و دعوت کو پورے طرح سمجھنے اور یہ معلوم کرنے کیلئے کہ "یہ تحریک اسلامی" کس نوع کی تحریک ہے؟ اس کا نصب العین کیا ہے؟ اس کا طریق کار کیا ہے اور کیوں ہے؟ آپ کو اس پورے لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہیئے جس کا یہ کتاب ایک جُزء ہے۔

|۸|-